جلد ۸۷   مئی ۱۹۷۷ء   عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۷	مئی ۱۹۷۷ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ	عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور

فون نمبر ـــــ ۴۱۱۰۱۶ ـــــ ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابو الخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نظامِ حکومت، خواہ جمہوری ہو یا آمرانہ، حاکمانہ اختیارات ایک مختصر سے طبقے ہی کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ضرور پایا جاتا ہے کہ اوّل الذکر نظامِ مملکت میں حکمران طبقہ عوامی خواہشات کو بروئے کار لاتا ہے اور مؤخر الذکر نظام میں برسرِ اقتدار گروہ کی مرضی عوام پر بالجبر مسلط کی جاتی ہے۔ آمریت کے پرستاروں نے دورِ جدید میں اپنے طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے "تخلیقی اقلیت" (CREATIVE MINORITY) کی حکمرانی کا نظریہ وضع کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ عوام کالانعام کو کیا معلوم کہ اُن کی بھلائی کن باتوں میں مضمر ہے اور کونسی چیزیں اُن کے حق میں مضر ہیں۔ چنانچہ اُن کے لیے فلاح و کامرانی کا واحد راستہ یہی ہے کہ معاشرے کی "تخلیقی اقلیت" جو فہم و ادراک کی بہترین صلاحیتیں رکھتی ہے قوت و طاقت کے سرچشموں پر قابض ہو کر اور عوامی خواہشات و رجحانات کو بالکل نظرانداز کر کے قوم کو اپنے منشا کے مطابق جس طرف چاہے، ہانک کر لے جائے، اسی میں اُس قوم کی فلاح کا حقیقی راز مضمر ہے۔

کسی مخصوص فرد یا طبقے کی مطلق العنان حکومت کا تصور کوئی نیا تصور نہیں۔ اِس تصور کے مظاہر ماضی میں مصر کے فراعنہ، بابل کے نمارِدہ، روما کے قیاصرہ اور فارس کے اکاسرہ جیسے طاغوتوں میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں یہ تصور ہٹلر، مسولینی، لینن اور سٹالن وغیرہ کی بھیانک شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ یہاں ہم اِس امر کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اِس تصور سے قطعی ناآشنا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بلاشبہ بعض بڑے جاہ و حشم کے مالک بادشاہ تخت و تاج پر قابض ہوئے، لیکن اُن کے سارے جاہ و جلال کے باوصف وہ کبھی اِس پندار میں مبتلا نہیں ہوئے کہ وہ قرآن و سنت

کو پسِ پشت ڈالنے کا حق رکھتے ہیں یا اُن کے احکام اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مقابلے میں زیادہ واجب التعمیل ہیں۔

یہ "سعادت" آج کے "روشن خیال" انسان کے حصے میں آئی ہے کہ اُس کے ذہن میں جب عوام پر اپنی کبریائی کا ٹھاٹھ جمانے کا سودا سماتا ہے تو وہ مکر و فریب اور مختلف قسم کے ناجائز ہتھکنڈوں سے پہلے تو اقتدار پر قابض ہوتا ہے، پھر ملک و قوم کے سارے وسائل، فوج اور انتظامیہ کی بے پناہ قوت سے ناحق فائدہ اُٹھاتے ہوئے پیرِ تسمہ پا بن کر عوام کی گردنوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اُس کے اِس جابرانہ طرزِ عمل کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اقتدار کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے، بلکہ وہ ہر لمحہ قوم پر یہی احسان جتلاتا رہتا ہے کہ وہ حکمران رہنے کی ساری صعوبتیں صرف عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جھیل رہا ہے اور اگر اُس نے تختِ اقتدار کو خیرباد کہہ دیا تو آسمان کی ساری آفتیں اور زمین کی تمام مصیبتیں اِس قوم پر اُمڈ پڑیں گی۔

زندگی میں حقیقی سکون چونکہ دلفریب دعووں کی بھرمار سے نہیں، بلکہ اُن دعووں کی عمل کے میدان میں تصدیق سے ہوتا ہے، اِس لیے جلد ہی عوام کے اندر بگڑے ہوئے حکمرانوں کے بارے میں اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ دکھ بھرے دل کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کی زندگی کسی شدید عذاب میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہے۔ اِن نااہل حکمرانوں کی غلط بخشیوں سے جو آبرو باختہ لوگ حکومت میں شریک ہوتے ہیں، اُنہیں قوم و ملک کی بھلائی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اُن کی ساری قوتیں یا تو اقتدار کی مرکزی شخصیت کی بے جا مدح سرائی پر صرف ہوتی ہیں یا حکومت سے اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے ناجائز فوائد حاصل کرنے میں کھپائی جاتی ہیں اور ملکی ذرائع کو ملت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنے کے بجائے بیکار کاموں میں ضائع کیا جاتا ہے۔ یوں تو عوام کا اضطراب زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر پانچ شعبے ایسے ہیں جن میں اِس کی لہریں بڑی تند و تیز ہوتی ہیں۔

جب بھی تختِ اقتدار پر کوئی فاشسٹ مسلط ہو جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے ملک کے امن و امان کو غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان فطری طور پر محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کا شدید آرزومند ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی اور اُس کے خاندان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہیں اور

معاشرہ امن کا گہوارہ ہوتا کہ وہ اپنی صلاحیتیں اعتماد کے ساتھ بغیر کسی ڈر اور خوف کے بروئے کار لا سکے۔ پُرسکون اور پُرامن ماحول میں انسان کے ذہن میں اپنی آزادی و خودمختاری عزتِ نفس اور حقوق کے تحفظ کا احساس پرورش پاتا ہے جو جمہوریت کے لیے آبِ حیات اور آمریت کے واسطے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس لیے دُنیا کے ہر آمر کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ جس معاشرے میں اُسے اقتدار حاصل ہوا ہے اُس میں لوگوں کو بے یقینی کا مُہلک مرض لاحق رہے اور اُنہیں اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہو کیونکہ یہی وہ مریضانہ ذہنی کیفیات ہیں جن میں انسان مبتلا ہو کر آزادی جیسی متاعِ گرانمایہ کو بھی تیاگ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اُسے معاشرے میں کوئی تحفظ حاصل نہیں، تو وہ جان کی امان پانے کی غرض سے فاشزم کی بے رحم جکڑ بندیوں کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کا اندازِ فکر اُس بے بس و مجبور انسان کا سا ہوتا ہے جو اپنی جان کے تحفظ کے سلسلے میں ہر طرف سے مایوس ہو کر جیل کی چار دیواری کے اندر پناہ تلاش کرتا ہے۔ اِس لیے جو حکمران ملک کو جیل خانہ بنا کر اُس پر حکومت کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، وہ پہلے اِس بات کا التزام کرتے ہیں کہ مُلکی حالات اس حد تک دگرگوں کر دیئے جائیں کہ عوام جیل کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دینے لگیں۔ دُنیا کے جن ممالک میں بھی فاشزم کا تسلط ہوا اُن میں امنِ عامہ کی صورتِ حال یا پہلے سے ناگفتہ بہ تھی یا جان بوجھ کر اِس قدر ناگفتہ بہ بنا دی گئی کہ عوام نے جان و مال کے تحفظ کی خاطر بحیثیت ایک قوم قید بامشقت کی زندگی بسر کرنا گوارا کیا۔

فاشزم کے خطرے کی دوسری بڑی علامت یہ ہے کہ عوام کا عدل و انصاف کے مقدس اداروں پر سے ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے۔ جمہوری ممالک میں عدالتیں لوگوں کی آزادی کی ضامن اور اُن سے روا رکھی گئی ناانصافیوں کو دُور کرنے اور اُنہیں انصاف دلانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خیال کی جاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے وہ یہ فرائض اسی صورت میں سرانجام دے سکتی ہیں جب وہ آزاد اور خودمختار ہوں اور حکومت اور انتظامیہ کی طرف سے اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جا سکے۔ دوسرے عدالت کی کرسیوں پر ایسے بااخلاق، صاحبِ عزم، قانع اور عدل پسند ماہرینِ قانون فائز ہوں جنہیں کوئی دُنیوی ترغیب و ترہیب جادۂ مستقیم سے ہٹا نہ سکے۔ وہ معاشرے میں ایسے باوقار انسان کی حیثیت سے زندہ رہیں

جن پر کوئی فرد یا ادارہ، خواہ اس کی حیثیت کتنی ہی اُونچی کیوں نہ ہو، کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے اور اگر کبھی انہیں ایسی صورتِ حال پیش آجائے تو وہ پورے عزم اور پامردی کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ عدالت کسی ملک میں ستم زدہ کی دُنیوی اعتبار سے آخری پناہ گاہ ہوتی ہے جس کی طرف وہ دادرسی کے لیے رجوع کرتا ہے، اور اگر اس کے بارے میں مظلوموں کے اندر یہ تاثر پھیل جائے کہ وہ اُن کی مظلومیت کا کوئی مداوا نہیں کرسکتی تو اُن کے ذہنی کرب اور یاس و ناامیدی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جس ملک کے عوام کو عدالتوں سے انصاف کی کوئی توقع باقی نہ رہے، اُن کے اندر آزادی اور اس کے تحفظ کی کوئی امنگ باقی نہیں رہتی اور وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو انتظامیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ اُن کی نگاہ میں اُس کی قوت ہی ملک کی سب سے غالب اور فیصلہ کن قوت ہوتی ہے جس کے اشارے پر تمام معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ عوام کا یہ طرزِ فکر کسی قوم کے اندر فاشزم کے تسلط کی راہ ہموار کرتا ہے۔

فاشزم جیسے انسانیت کش نظام کو اُس بدنصیب ملک پر قبضہ جمانے کا موقع ملتا ہے جس میں عوام اصولوں سے وابستہ ہونے اور ان کا عَلم بلند کرنے کے بجائے بعض مخصوص افراد کی ذہنی غلامی میں گرفتار ہو کر ان کی شخصیتوں کو مصنوعی طریقوں سے اُبھارنے میں مصروف ہو جائیں۔ اصول پسندی کی فضا میں افراد اُس حد تک قابلِ تعظیم تصور کیے جاتے ہیں جس حد تک وہ اصولوں کے پابند ہوں اور انہیں سربلند رکھنے کے لیے سعی و جہد کریں۔ اِس فضا کے اندر اصولوں ہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور پوری قوم ان کی عملداری قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوتی ہے۔ یہ فضا جمہوریت کے فروغ کے لیے بڑی سازگار ہوتی ہے۔

اس کے مقابلے میں جب کسی قوم کے سیاسی افق پر فسطائیت کے مہیب سائے پھیلنے شروع ہو جائیں تو وہاں شخصیت پرستی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔ عوام کے سامنے چند شخصیتیں "نجات دہندوں" کی حیثیت سے بڑے طمطراق کے ساتھ نمایاں ہو کر آتی ہیں اور وہ لاف زنی، سنسنی خیز بیانات، جذباتی نعروں اور نمائشی سرگرمیوں کے زور سے عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

چونکہ ان "نجات دہندوں" کا واحد مقصد اپنی شخصیت کے سحر سے تخت اقتدار پر بلا شرکتِ غیرے تاحینِ حیات قابض رہنا ہوتا ہے اس لیے وہ اس بات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ عوام کے دل و دماغ میں اُن کے مافوق البشر ہونے کا تاثر قائم رہے اور یہ تاثر عقیدہ کی سی شدت، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ان کے اذہان پہ اس طرح مُستولی ہو جائے کہ اُن کے دلوں میں کبھی اس بات کی خواہش ہی پیدا نہ ہونے پائے کہ وہ فوق البشر کی کارگزاریوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے سکیں یا اس نہج پر سوچنے کی جرأت کر سکیں کہ اُن کے ملک کے سربراہ سے کوئی خطا بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ "فوق البشر" کا یہ طلسم اس ماحول میں تو قائم نہیں رہ سکتا جس میں عوام کو اپنے حکمرانوں پہ احتساب کی آزادی ہو۔ لہٰذا جو لوگ بھی "فوق البشر" بننے کا داعیہ لے کر اُٹھتے ہیں وہ ایک طرف تو ملک کے اندر تنقید و احتساب کے سارے دروازے مسدود کر دیتے ہیں اور دوسری طرف اس بات کا پورا پورا التزام کرتے ہیں کہ قوم کے سارے ذرائع ابلاغ اُن کی شخصیت کا نقش اُبھارنے میں بے دریغ استعمال کیے جائیں۔ جب عوام کی نگاہیں کسی اخبار پہ پڑیں تو وہاں انہیں فوق البشر کی دلآویز تصویروں، اُس کے وجد آفرین پیغامات اور دل فریب بیانات اور اس کے محیر العقول کارناموں کے ذکر کے علاوہ کوئی چیز نہ ملے۔ جب ریڈیو سنا جائے تو اُس میں صرف اُس ذات شریف کا تذکرہ ہی ہو اور جب ٹیلیویژن دیکھا جائے تو اس کی سکرین پہ اس کی شخصیت اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے۔ اور اس طرح عوام کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہو جائے کہ اُن کی پوری قوم فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل تہی دست اور قلاش ہے۔ بس ایک فوق البشر کی مقدس ذات ہی ہے کہ جس کی غیر معمولی صلاحیتوں اور جس کے بے پناہ جذبۂ عمل و ایثار کی وجہ سے قوم زندہ ہے۔ اس بنا پہ اس کے درمیان اس فوق البشر کا وجود خدا کی بے پایاں عنایات میں سے ایک بہت بڑی عنایت ہے جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے اور اگر خدانخواستہ تخت اقتدار اس کے بابرکت وجود سے خالی ہو گیا تو پھر قوم کا زندہ رہنا ممکن نہ رہے گا۔ لہٰذا اس کی فلاح و بقا کا راز صرف اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اس فوق البشر کو تخت اقتدار پہ ہمیشہ کے لیے براجمان رکھے اور اس کی غیر مشروط اطاعت پہ ہر لمحہ کمر بستہ رہے اور اُسے اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرے۔

ہر فاشسٹ حکمران پروپیگنڈا کے فن میں ماہر و مشاق ہونے کے علاوہ اس بات کا بھی خاص طور پر اہتمام کرتا ہے کہ وہ ایسے کارنامے سرانجام دے یا اس کی ایسی کارگزاریاں عوام کے سامنے لائی جائیں جو قومی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے خواہ کسی معمولی اہمیت کی بھی حامل نہ ہوں مگر سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے غایت درجہ کارآمد ہوں۔ دُنیا ٹھوس حقائق سے عبارت ہے اس لیے جھوٹی کارروائیوں کی حقیقت جلد ہی کھل کر سامنے آجاتی ہے اور عوام کے اندر یاس و قنوطیت پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے فاشزم کا ہر علمبردار قوم کے گرتے ہوئے اعتماد کو سہارا دینے کے لیے زیادہ سنسنی خیز باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی فکری لغزشوں اور میدان عمل میں اپنی ناکامیوں اور کمزوریوں کو کھوکھلے نعروں، دل فریب وعدوں اور سطحی کارناموں اور نمائشی قسم کی سرگرمیوں سے پورا کریں کیونکہ ان اخلاق سوز حربوں سے ہی ان کی شخصیت کا طلسم کچھ دیر تک قائم رکھا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں فاشسٹ نظام اُسی ملک میں کامیابی کے ساتھ اپنے قدم جما سکتا ہے جو اچھی اور صحت مند روایات کے اعتبار سے یا تو بالکل ویرانہ ہو یا جھوٹے پروپیگنڈے کی مدد سے ان روایات کے خلاف ایک ایسی معاندانہ فضا قائم کر دی جائے جس میں یہ دم توڑ جائیں اور عوام ان روایات کو تلخ یادیں کہہ کر اپنوں ذہنوں سے محو کر دیں۔ فاشزم عام طور پر قابل قدر روایات کے لاشوں پر سے گزر کر ہی آتا ہے۔ آپ نازی جرمنی کو دیکھیے کہ وہاں یہ نظام کس طرح برپا کیا گیا۔ یورپ کی دیگر قوموں کی طرح اہل جرمن میں بھی مسیحی روایات کا احترام موجود تھا۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جب کوئی قوم صحت مند روایات سے وابستہ ہو تو اُسے اپنی اجتماعی زندگی کے لیے قانونی جکڑ بندیوں کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آتی اس لیے وہاں کے عوام میں آزادی کا شعور پرورش پاتا ہے۔ فاشزم کے داعیوں نے جب جرمنی پر یہ نظام مسلط کرنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب کے ذریعے مسیحی روایات کو اتنی بے دردی سے پامال کیا کہ اُن کے اندر کوئی جان باقی نہ رہی۔ جس رفتار سے عوام پر ان روایات کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اسی رفتار سے ان کا قومی شیرازہ منتشر ہونے لگا، اور جرمن قوم کو اس بات کا شدید خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کا قومی وجود ہی فنا نہ ہو جائے۔ اس لیے اسے اپنی شیرازہ بندی کے لیے ایک ایسے مضبوط ضابطہ کی احتیاج محسوس ہوئی

جس کی غیر معمولی گرفت اس کے مائل بہ انتشار اجزاء کو پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔ یہ قومی روایات سے اس بغاوت کا نتیجہ تھا کہ المانیہ کی سرزمین پر فاشزم کو تسلط کا موقع حاصل ہوا۔

روس ایک ایسا ملک ہے جس میں اشتراکیت کے نام پر فاشسٹ نظام کو پوری قوت سے پروان چڑھایا گیا ہے۔ اشتراکی انقلاب سے پہلے اس میں وہ سارے حالات موجود تھے جو فاشزم کو سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں۔ یہاں اچھی اور صحت مند روایات کا بالکل فقدان تھا۔ حکمران ٹولے کے ظلم و استبداد اور اس کی ریشہ دوانیوں اور زبردست آزاریوں کی وجہ سے نچلے طبقے کی زندگی بالکل عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ یاس اور ناامیدی کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں انہیں دُور دُور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ وہ اپنے سامنے کوئی راہ نجات نہ پاتے تھے۔ ان اندوہناک حالات میں جب انہوں نے استحصالی قوتوں کے خاتمے کا مژدۂ جانفزا سنا تو ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے بے خبری کے عالم میں خود آگے بڑھ کر فسطائی نظام کی علمداری قبول کی۔ اگر وہاں کے عوام کسی صحت مند نظام حیات سے عملی طور پر کچھ بھی آشنا ہوتے اور اس کی پسندیدہ روایات ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتیں تو وہ ان دونوں نظاموں کے مصائب اور محاسن کا پوری طرح موازنہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن قدم اُٹھاتے۔ لیکن چونکہ روس میں کوئی حیات آفرین نظامِ فکر و عمل پہلے سے موجود ہی نہ تھا اس لیے خانۂ خالی را دیو ان می گیرد کے مطابق وہاں فاشزم نے قبضہ کر لیا۔

فاشزم کے تسلط کے سلسلے میں یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ یہ جابرانہ نظام اُسی معاشرے میں غلبہ حاصل کرتا ہے جو انسانی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرگھٹ ہو، جس میں لوگوں کی عظیم اکثریت وقوف و آگہی سے عاری ہو چکی ہو، جہاں خود غرضی، طمع، لالچ جیسے اخلاقی عیوب نے عوام کو زندگی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد سے یکسر ناآشنا کر دیا ہو۔ اور اس طرح معاشرے کے اجتماعی ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو اور لوگ گھٹیا مفادات کی خاطر اپنی خودداری، عزتِ نفس حتیٰ کہ اپنی قومی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ کوئی قوم جب تک حیوانیت کی پست سطح سے اٹھ کر زندگی بسر کرنا گوارا نہیں کرتی وہ فاشزم کے فروغ کے لیے سازگار ماحول فراہم نہیں کر سکتی۔ فاشزم کا (باقی بر صفحہ ۴۸)

ہجرت اِلیٰ المدینہ

(۲)

غارِ ثور کی سرگذشت

بیہقی نے حضرت محمد بن سیرین کے حوالے سے مُرسَلاً یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کی مجلس میں کچھ اس طرح کی باتیں کیں جن سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ اُن کو حضرت ابوبکرؓ پر فضیلت دے رہے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "خدا کی قسم ابوبکرؓ کی ایک رات آلِ عمر سے افضل ہے۔" پھر انہوں نے بیان کیا کہ جس رات حضورؐ غارِ ثور تشریف لے گئے، اور ابوبکرؓ آپؐ کے ساتھ تھے، تو حال یہ تھا کہ کبھی ابوبکرؓ آپؐ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے چلنے لگتے۔ حضورؐ نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ مجھے پیچھا کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو پیچھے چلنے لگتا ہوں اور جب یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں آگے کوئی خطرہ درپیش نہ ہو تو آگے آجاتا ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا "تمہارا مطلب یہ ہے کہ کوئی آفت آئے تو میرے بجائے تم پر آئے؟" انہوں نے عرض کیا جی ہاں۔ پھر جب غار پر پہنچے تو ابوبکرؓ نے عرض کیا آپ ذرا ٹھیریں، میں اندر جا کر غار کو آپ کے لیے صاف اور محفوظ کر دوں۔ چنانچہ اندر جا کر انہوں نے غار کو محفوظ کیا، پھر نکلے، مگر یاد آیا کہ ایک بِل اور رہ گیا ہے اس لیے واپس گئے اور اُسے بھی بند کیا۔ تب حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ اندر تشریف لے آئیں۔
بعض روایات میں اس کی مزید تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر ایک ایک سوراخ اور ایک ایک بِل کو تلاش کرتے گئے اور اپنی چادر پھاڑ پھاڑ کر اسے بند کرتے چلے گئے۔

اسی سے ملتی جلتی روایت حافظ ابو القاسم بَغَوِی نے ابن ابی مُلَیکہ سے نقل کی ہے، اور اس کے آخر میں نافع بن عمر الجُمَحِی کا یہ بیان درج کیا ہے کہ غار میں ایک بِل رہ گیا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے اس پر اپنی ایڑی لگا دی تا کہ کوئی موذی جانور اس سے نکل کر حضورؐ کو کاٹ نہ لے۔ یہی بات بزّار نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے، اور طبرانی نے حضرت اسماءؓ سے روایت کی ہے۔

غارِ ثور میں نازک ترین لمحہ

اُدھر قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں مکہ اور اس کے اطراف کا کونہ کونہ چھان مارا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ پھر وہ دو ماہر کھوجیوں کو لائے تاکہ وہ نشاناتِ قدم سے آپ کا سُراغ لگائیں۔ یہ کھوجی سراغ لگاتے ہوئے غارِ ثور تک پہنچ گئے۔ مگر وہاں انہوں نے دیکھا کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے۔ ایک کھوجی کُرز بن عَلقَمَہ خُزاعی نے کہا یہاں سے آگے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ قریش کے جو لوگ کھوجیوں کے ساتھ آئے تھے ان میں سے ایک نے کہا غار میں بھی چل کر دیکھ لیا جائے۔ مگر اُمَیّہ بن خَلَف نے کہا "یہاں کیا پاؤ گے؟ اِس غار پر تو مکڑی کا جالا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش سے بھی پہلے کا تنا ہوا معلوم ہوتا ہے"۔ اِس کے بعد سب اُلٹے پلٹ گئے۔ یہی موقع تھا جب حضرت ابو بکرؓ رضی اللہ عنہ نے دشمنوں کو عین غار کے دہانے پر کھڑا دیکھ کر حضور سے عرض کیا "یا رسول اللہ، اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے پاؤں کے نیچے دیکھے تو ہمیں دیکھ لے گا"۔ حضورؐ نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ "اے ابو بکر تمہارا کیا خیال ہے اُن دو آدمیوں کے متعلق جن میں تیسرا اللہ ہے"؟ (بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی، وکتاب التفسیر، وباب الہجرت۔ مسلم فی الفضائل، ترمذی فی التفسیر، مُسند احمد، مرویاتِ ابی بکر صدیق)۔ حافظ ابو بکر احمد بن علی الاُمَوی نے مُسندِ ابی بکر صدیق میں اس سلسلے کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں سے ایک میں بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت وہ لوگ غار کے دہانے پر کھڑے ہوئے تھے اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت ابو بکرؓ دشمنوں کی نقل وحرکت دیکھ رہے تھے۔ حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، یہ آپ کی قوم آپ کی تلاش میں آپہنچی ہے۔ خدا کی قسم میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ اس لیے روتا ہوں کہ کہیں میری آنکھوں کے سامنے آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے"۔ حضورؐ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ اِسی چیز کا ذکر قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ	اگر تم (مسلمان) اُس کی (یعنی اللہ کے نبیؐ کی) مدد
إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ	نہ کرو گے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اُس کی مدد اُس
اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ	وقت کر چکا ہے جب اُسے کافروں نے نکال دیا تھا جب وہ
لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا	دو میں کا ایک تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ
(التوبہ - ۴۰)	اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے

حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ کو قتل یا گرفتار کرنے کے لیے انعام کا اعلانِ عام

یہ آخری مقام تھا جہاں دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پانے کی امید کر سکتے تھے۔ یہاں جب آپ نہ ملے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ آپ اُن کی دسترس سے باہر جا چکے ہیں۔ اِس کے بعد انہوں نے اعلانِ عام کر دیا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکرؓ کو پکڑ کر لائے یا قتل کر دے اسے دونوں کی پوری دِیت دی جائے گی، یعنی سو سو اُونٹ۔ یہ بَلاذری کی روایت ہے اور ابن القیمؒ نے زادُ المعاد میں اِسی کو قبول کیا ہے۔ ابن ہشام اور ابن جریر نے صرف پکڑ لانے والے کو سو اُونٹ انعام دینے کا ذکر کیا ہے اور بلاذری نے اسے ایک کمزور قول کی حیثیت سے نقل کیا ہے۔

غار سے روانگی

بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ تین شب و روز غار میں رہے۔ یہی طَبَرانی میں حضرت اسماء کی روایت ہے اور یہی ابن عبد البرؒ، اور ابن سعد اور ابن اسحاق کا بیان ہے، اس لیے وہ روایات قابلِ قبول نہیں ہیں جو مُسندِ احمد اور حاکم میں طَلْحۃُ البَصْرِی سے منقول ہوئی ہیں کہ غار میں قیام دس دن سے زیادہ رہا۔ درحقیقت تین ہی شب و روز میں حضورؐ کی تلاش کے لیے قریش کی سرگرمیاں سرد پڑ چکی تھیں۔ چنانچہ عبد اللہ بن اُرَیقِط حسبِ ہدایت دونوں اُونٹنیاں جو اُس کی تحویل میں تھیں، لے کر تیسری رات کے آخری حصہ میں غارِ ثَور پر پہنچ گیا۔ ٹھیک وقت پر حضرت اسماءؓ بھی زادِ راہ ایک تھیلے میں لیے ہوئے پہنچ گئیں۔ مگر اُس کو باندھنے کے لیے کوئی چیز سامنے لانے کا انہیں خیال نہ رہا۔ آخر کار انہوں نے اپنا نِطاق (وہ کپڑا جو اُس زمانہ میں خواتین کمر پر لپیٹتی تھیں) کھول کر اُسے پھاڑا، ایک حصہ سے توشہ باندھ کر کجاوے کے ساتھ لٹکا دیا اور اپنی کمر باندھنے کے لیے دوسرے حصے پر اکتفا کیا (ابن ہشام اور ابن جریر، بحوالہ محمد بن اسحاق)۔ اِسی بناء پر حضرت اسماء کو ذاتُ النِطاقَین (دو نِطاقوں والی) کہا جاتا ہے۔ بخاری میں حضرت اسماء کی اپنی روایت یہ ہے کہ جب توشہ دان کو باندھنے کی ضرورت پڑی تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کو اپنا نِطاق پھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اِس کے بعد یہ قافلہ اِس طرح روانہ ہوا کہ ایک اُونٹنی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ دوسری پر حضرت ابو بکرؓ تھے اور انہوں نے خدمت کے لیے عامرؓ بن فُہَیرہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا تھا۔ آگے آگے عبد اللہ بن اُرَیقِط راستہ بتانے کے لیے پیدل چل رہا تھا۔ اِس طرح اُس عظیم الشان سفرِ ہجرت کی ابتداء ہوئی جس نے دُنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ ابن سعد اور بلاذری نے تعیُّن کے ساتھ لکھا ہے کہ غارِ ثَور

سے اس مبارک قافلے کی روانگی ۴ ربیع الاول کو پیر کے دن ہوئی۔ امام احمد نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپؐ ربیع الاول میں پیر کے روز غار سے روانہ ہوئے، لیکن اس مہینے کی تاریخ کونسی تھی، اس کی انہوں نے تصریح نہیں کی۔ ابن اسحاق نے مکہ سے حضورؐ کے نکلنے کی تاریخ یکم ربیع الاول بتائی ہے، مگر غار سے نکلنے کی تاریخ انہوں نے نہیں بتائی۔ قسطلانی نے "مواہبُ اللَّدُنیہ" میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ، ہفتہ اور اتوار کی راتیں غار میں گزاریں اور پیر کی رات وہاں سے روانہ ہوئے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ ربیع الاول سنہ ۵۳ عامُ الفیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی۔

سفر کا حال سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن اریقط جب اس قافلے کو لے کر چلا تو اس نے عام راستے سے ہٹ کر مدینے جانے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا تاکہ دشمنوں سے بچ کر نکلا جا سکے۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ چونکہ تجارتی سلسلے میں اکثر پھرتے رہتے تھے اس لیے لوگ ان کو دیکھ کر پہچان لیتے اور پوچھتے یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ وہ جواب دیتے ھذا الرجل یھدینی السبیل۔ "یہ ایک صاحب ہیں جو میری راہنمائی کر رہے ہیں"۔ طبرانی میں حضرت اسماءؓ سے اور مسندِ احمد، مرویاتِ انس بن مالکؓ، اور بخاری باب الہجرت میں حضرت انسؓ سے بھی اسی سے ملتا جلتا مضمون منقول ہوا ہے[1]۔

بخاری اور مسلم میں حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ ہم دوسرے دن دوپہر تک چلتے رہے۔ جب گرمی تیز ہوئی تو میں نے نظر دوڑائی کہ کہیں سایہ کی جگہ ہے یا نہیں۔ دیکھا کہ ایک چٹان کے نیچے ابھی سایہ موجود ہے۔ وہاں جا کر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرش بچھا کر عرض کیا کہ آپ آرام فرمالیں۔ پھر میں ہر طرف دیکھتا رہا کہ کہیں ہماری تلاش میں تو کوئی نہیں آرہا ہے۔ اتنے میں ایک لڑکا بکریاں چراتا ہوا سایہ میں پناہ لینے کے لیے اسی چٹان کی طرف آگیا۔ میں نے اس سے کہا ہمیں اپنی کسی بکری کا دودھ نکال دوگے؟ وہ اس پر راضی ہوگیا۔ میں نے بکری کے تھن اور اس لڑکے کے ہاتھ صاف کرا کے ایک برتن میں دودھ نکلوایا۔ پھر تھوڑا سا پانی ڈال کر اسے ٹھنڈا کیا اور لے جا کر

---

[1] یہ بھی توریہ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ یہ میرے رہنما ہیں۔ سننے والوں نے سمجھا کہ یہ راستہ بتانے والے ہیں، اور حضرت ابوبکرؓ نے بالکل سچ فرمایا کہ یہ میرے ہادی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پلایا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ سُراقہ بن مالک بن جُعشُم کا واقعہ بیان فرماتے ہیں جسے امام بخاری نے مناقب المہاجرین اور باب ہجرت میں، اور امام مسلم نے کتاب الزّہد باب الہجرت میں مختصراً نقل کیا ہے، مگر اس کی تفصیل بخاری باب الہجرت کی ایک روایت میں خود سُراقہ کی زبانی اُس کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن مالکؒ کے حوالہ سے امام زُہری نے بیان کی ہے، اور اس کی مزید تفصیلات سیرت ابن ہشام اور طبقاتِ ابن سعد وغیرہ میں ملتی ہیں۔

سُراقہ کا واقعہ

سراقہ بنی مُدلج کا رئیس تھا اور قُدَید کے قریب اُس کا علاقہ واقعہ تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ ہمارے پاس قریش کے آدمی یہ پیغام لے کر آئے کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابوبکرؓ کو قتل کر دے یا گرفتار کر لے آئے اُن میں سے ہر ایک کی پوری دِیت (یعنی سَو سَو اُونٹ) دی جائیگی۔ اس کے بعد ایک روز میں اپنی قوم کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر مجھ سے کہا "ابھی میں نے سواحل پر کچھ آدمی جاتے ہوئے دیکھے ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے ساتھی ہیں"۔ میں سمجھ گیا کہ واقعی وہی ہیں۔ مگر میں نے اُس سے کہا کہ وہ نہیں بلکہ تم نے فلاں فلاں کو دیکھا ہے جو ابھی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ پھر میں اس مجلس میں تھوڑی دیر ٹھیرنے کے بعد اُٹھ کر اپنے گھر گیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرح خاموشی کے ساتھ نکل گیا کہ دوسرے لوگوں کو میرے جانے کا علم نہ ہونے پائے۔ (ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ "میں نے اس اندیشے سے کیا کہ کہیں انعام میں بستی کے دوسرے لوگ شریک نہ ہو جائیں")۔ میں اُن کے قریب پہنچا تھا کہ یکایک اپنے گھوڑے پر سے گر پڑا۔ میں نے فال کے تیر اپنے ترکش سے نکال کر فال دیکھی تو وہ میری خواہش کے خلاف نکلی۔ میں اس کی پروا کیے بغیر پھر چلا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت صاف سُنائی دے رہی تھی۔ حضورؐ کسی طرف مُڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے، مگر ابوبکرؓ بار بار ہر طرف مُڑ مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ اتنے میں یکلخت میرے گھوڑے کے پاؤں زمین میں گھٹنوں تک دھنس گئے اور میں اُس پر سے گر پڑا۔ (حضرت بَراءؓ بن عازِب کی روایت خود حضرت ابوبکرؓ سے یہ ہے کہ ہم اُس وقت سخت زمین سے گزر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ ہمارا تعاقب کرنے والا بہت

۱؎ ابن ہشام نے ان کے نام کی تصحیح کی ہے عبدالرحمٰن بن حارث بن مالک بن جُعشُم۔

قریب آگیا ہے۔ آپؐ نے اس پر دُعا کی اور اس کا گھوڑا زمین میں پیٹ تک دھنس گیا۔ حضرت انس کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خدایا اسے گرا دے) ۔ سُراقہ کہتا ہے کہ میں نے پھر فال نکالی تو وہ میری خواہش کے خلاف نکلی۔ تب میں نے پُکار کر امان مانگی اور وہ ٹھیر گئے۔ میں اپنے گھوڑے پر چڑھ کر ان کے پاس پہنچا۔ جو کچھ مجھ پر گزری تھی اس سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام کامیاب ہو کر رہے گا (ابن ہشام میں محمد بن اسحاق کی روایت امام زُہری سے یہ ہے کہ سُراقہ نے پکار کر کہا میں سُراقہ بن جُعْشُم ہوں، آپ لوگ مجھے موقع دیں کہ میں آپ سے بات کروں۔ خدا کی قسم میں آپؐ کو کوئی گزند نہ پہنچاؤں گا اور نہ مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہو گی جو آپ کو ناگوار ہو)۔ سراقہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری کے لیے دِیَت کا اعلان کیا ہے اور لوگ اس فکر میں پھر رہے ہیں کہ یہ انعام حاصل کریں۔ پھر میں نے زادِ راہ اور سامان کی پیشکش کی۔ مگر آپؐ نے اِس کے سوا اور کسی چیز کی خواہش مجھ سے نہیں کی کہ میں آپ کی اطلاع کسی کو نہ دوں۔ میں نے درخواست کی کہ مجھے ایک امان نامہ لکھ دیجیے۔ حضورؐ نے عامر بن فُہیرہ کو حکم دیا اور انھوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر تحریر مجھے لکھ دی۔ حضرت انس بن مالک کی روایت میں ہے کہ سُراقہ نے عرض کیا، اے اللہ کے نبی، مجھے حکم دیجیے جو کچھ آپ چاہیں۔ حضورؐ نے فرمایا بس اپنی جگہ ٹھیرو اور کسی کو ہم تک نہ پہنچنے دو۔ اس طرح جو شخص چند لمحے پہلے دشمنِ جان تھا، وہ پاسبان بن گیا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ اس کے بعد جو بھی حضورؐ کے تعاقب میں آتا اُس سے سُراقہ کہتا کہ واپس جاؤ، میں نے اطمینان کر لیا ہے کہ وہ اِدھر نہیں ہیں، اور تم لوگ جانتے ہو کہ میں کیسی نظر رکھتا ہوں اور سراغ رسانی میں کتنا ماہر ہوں۔

ابن اسحاق اور موسٰی بن عُقبہ سُراقہ کا بیان نقل کرتے ہیں کہ جو تحریر میں نے اُس وقت لی تھی اُسے اپنے پاس محفوظ رکھا اور کئی سال بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حُنَین اور طائف کے معرکوں سے پلٹ جِعْرانہ (یا جِعِرّانہ) میں ٹھیرے ہوئے تھے تو میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور وہ تحریر پیش کر کے عرض کیا "میں سُراقہ بن جُعْشُم ہوں اور یہ آپ کی دی ہوئی تحریر ہے"۔ فرمایا "آج وفائے عہد اور ادائے حق کا دن ہے۔ قریب آجاؤ"۔ میں حضورؐ کے قریب گیا اور اسلام لے آیا۔ طَبَرانی نے سُراقہ کے اِس پورے واقعہ کا خلاصہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ سے روایت کیا ہے۔

اِستیعاب میں ابن عبدالبرؒ نے اور الاصابہ میں ابن حجرؒ نے حضرت حسن بصری کی مُرسل روایت حضرت سُفیان بن عُیَینہ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنہی حضرت سُراقہؓ بن مالک کو مخاطب کر کے فرمایا "وہ بھی کیا وقت ہو گا جب تم کِسریٰ کے کنگن پہنو گے"۔ اس ارشاد کے چند ہی سال بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شاہ ایران کے کنگن اور اس کا کمر پٹہ اور اس کا تاج لایا گیا تو انہوں نے حضرت سُراقہ کو بُلایا اور یہ چیزیں ان کو پہنا کر کہا ہاتھ اُٹھاؤ اور کہو "تعریف ہے اُس خدا کی جس نے یہ چیزیں اُس کسریٰ بن ہُرمُز سے چھین لیں جو کہتا تھا کہ میں لوگوں کا رب ہوں، اور انہیں بنی مُدلِج کے ایک بدّو سُراقہ بن مالک بن جعشم کو پہنا دیا"۔ سہیلی نے روض الاُنُف میں اس واقعہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ مگر غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے ہم اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔

اُمِّ مَعْبَد کا قصہ قُدَید ہی کے علاقہ سے گزرتے ہوئے یہ مقدس قافلہ بنی خُزاعہ کی ایک عورت اُمِّ معبد کی قیام گاہ پر پہنچا۔ بعض مصنّفین نے اس کو سُراقہ کے واقعہ سے پہلے بیان کیا ہے اور بعض نے اس کے بعد۔ ہم نے سراقہ کے واقعہ کو اس بنا پر مقدم رکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے غار سے روانگی کے بعد پیش آنے والے حالات بیان کرتے ہوئے پہلے اُسی کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اِسی وجہ سے حافظ ابن قیمؒ نے بھی زادُ المَعاد میں اس کو مقدم رکھا ہے۔

ابن خُزَیمہ، حاکم، بیہقی، البغوی، ابن عبدالبرؒ، بزّار، طبرانی اور ابن سعد وغیرہم نے مختلف سندوں سے یہ روایت نقل کی ہے اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں خود اُمِّ مَعْبَد کے حوالے سے اس کو درج کیا ہے کہ جب یہ حضرات قُدَید سے گزر رہے تھے تو راستے میں اُمِّ مَعْبَد (عاتکہ بنت خالد) کے خیموں پر پہنچے جو قبیلۂ خُزاعہ کی شاخ بنی کعب سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ پختہ عمر کی باعفت اور شاندار عورت تھی اور اُن لوگوں کی میزبانی کیا کرتی تھی جو اس کے پاس سے گزرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی جب وہاں پہنچے تو وہ اپنے خیمہ کے آگے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ زمانہ قحط کا تھا جس سے سارا علاقہ بُری طرح متأثر تھا۔ اِن حضرات نے اس سے کہا کہ دودھ، یا گوشت، یا کھجوریں، جو کچھ بھی تمہارے پاس ہو، ہمیں دو، ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اس نے کہا واللہ، اگر ہمارے پاس کچھ بھی ہوتا تو ہم آپ لوگوں کی ضیافت کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ایک بکری پر پڑی جو خیمے کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ حضورؐ نے پوچھا "معبد کی ماں، یہ بکری

کیسی ہے؟" اس نے کہا" یہ بیچاری اپنی لاغری اور کمزوری کی وجہ سے دوسری بکریوں کے ساتھ چرنے نہ جا سکی"۔ آپؐ نے پوچھا" یہ کچھ دُودھ دے سکتی ہے؟" اُس نے عرض کیا" یہ اِس سے زیادہ نڈھال ہے کہ دُودھ دے سکے"۔ فرمایا" کیا تم مجھے اجازت دیتی ہو کہ میں اِس کا دُودھ دوھ لوں؟" اُس نے کہا" صدقے جائیں میرے ماں باپ آپ پر، اگر آپ اس میں کچھ بھی دودھ پائیں تو ضرور نچوڑ لیں"۔ آپ نے بکری کو طلب فرمایا، پھر اُس کے پاؤں باندھے، اس کے تھنوں پر (اور ایک روایت میں ہے کہ پیٹھ پر بھی) دستِ مبارک پھیرا، دُعا فرمائی کہ یا اللہ اس عورت کی بکریوں میں برکت دے، اور اللہ کا نام لے کر دُودھ دوہنا شروع کیا۔ خدا کی شان، بکری نے ٹانگیں پھیلائیں، جُگالی کرنے لگی اور دُودھ کی دھار اُس کے تھنوں سے بہ نکلی۔ حضورؐ نے ایک بڑا برتن منگایا جس میں ایک پورے گروہ کو سیر کر دینے کے قابل دُودھ آ سکے۔ آپ دوھتے چلے گئے یہاں تک کہ برتن لبالب بھر گیا اور اُوپر جھاگ آگئے۔ آپؐ نے پہلے اُمِ معبد کو پلایا حتیٰ کہ وہ سیر ہو گئی۔ پھر اپنے ساتھیوں کو پلایا اور وہ بھی سیر ہو گئے۔ آخر میں آپ نے خود پیا اور فرمایا ساقی القومِ اٰخِرُھُم" لوگوں کو پلانے والا خود آخر میں پیتا ہے"۔ اس کے بعد دوبارہ آپؐ نے اُس برتن کو دُودھ سے بھر کر معبد کی ماں کے حوالے کیا اور یہ فرما کر آگے روانہ ہو گئے کہ یہ دُودھ معبد کے باپ کو دے دینا جب وہ آئے۔

اُمِ معبد حضورؐ کا حلیۂ شریف بیان کرتی ہے

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اُس کا شوہر اپنی دُبلی پتلی بکریاں لیے ہوئے پلٹا۔ دُودھ سے بھرا ہوا برتن دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا" معبد کی ماں یہ دُودھ کہاں سے آیا؟" وہ بولی" خدا کی قسم، ایک مبارک آدمی کا گزر یہاں سے ہوا تھا، اُس نے یہ کچھ کیا"۔ پھر اُس نے سارا واقعہ اپنے شوہر کو سُنایا۔ اُس نے کہا ذرا اُس کا حُلیہ تو مجھے بتا۔ وہ کہنے لگی" میں نے ایک ایسا شخص دیکھا جس کا حُسن و جمال نمایاں تھا، چہرہ روشن تھا، اخلاق پاکیزہ تھے۔ بدن نہ بھاری بھرکم تھا نہ نحیف، خوبصورت اور خوش اندام تھا، آنکھوں میں گہری سیاہی تھی، پلکیں لمبی تھیں، آواز بلند تھی مگر کرخت نہ تھی، آنکھوں کی پُتلیاں بہت سیاہ اور ڈھیلے بہت سفید تھے، آنکھوں کے گوشے سیاہی مائل تھے، بھویں نہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں نہ بالکل ملی ہوئی بلکہ درمیان میں ہلکے ہلکے بال تھے اور بھوؤں کے کنارے باریک تھے، بال نہایت سیاہ تھے، گردن میں درازی تھی، ڈاڑھی گھنی تھی۔ خاموش ہوتا تو اس کا وقار نمایاں ہوتا تھا۔ بولتا تو معلوم ہوتا کہ اُس کی آواز گردِشِ ذہن پیش

پر چھا گئی ہے، گفتگو ایسی تھی جیسے زبان سے موتیوں کی لڑی سلسلہ وار نکلتی چلی آرہی ہو، کلام شیریں اور واضح تھا، نہ کم گو تھا نہ بانُون، دُور سے سُنو تو اس کی آواز سب سے زیادہ بلند مگر خوش آہنگ محسوس ہوتی اور قریب سے سُنو تو بہت شیریں اور لطیف معلوم ہوتی تھی، میانہ قد تھا، نہ ایسا دراز قد کہ بدنما نظر آئے اور نہ اتنا پست قد کہ کوئی نگاہ اس سے بلند تر کی طرف متوجہ ہو۔ اپنے ساتھیوں میں وہ سب سے زیادہ خوش منظر تھا اور سب سے بہتر قدر و منزلت رکھتا تھا۔ اس کے رفقاء اُسے گھیرے رہتے تھے، اُس کی بات بڑی توجہ سے سُنتے اور اس کے حکم پر دوڑ پڑتے تھے۔ وہ مخدوم تھا، مالوف تھا، نہ تُرش رُو تھا اور نہ دُرشت کلام۔"

ابو مَعبد یہ سُن کر بول اُٹھا کہ خدا کی قسم یہ تو وہی صاحبِ قریش تھے جن کا ذکر ہم سُنتے رہے ہیں۔ اگر میں ان سے ملتا تو اُن کا ساتھ دینے کی درخواست کرتا، اور اب موقع ملا تو میں ضرور اِس کی کوشش کروں گا۔ (بیہقی اور ابن سعد نے عبدالملک بن وَہب المَذحِجی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ابو معبد مسلمان ہوئے اور ہجرت کرکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حافظ ابونُعیم نے عبدالملک کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ اُمِّ معبد بھی مسلمان ہوئیں اور ہجرت کرکے حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئیں)۔

مدینے میں حضورؐ کا انتظار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکّے سے نکلنے کی اطلاع مدینے پہنچ چکی تھی۔ بخاری باب الہجرت میں زُہری عن عُروَہ بن زبیر کی سند سے یہ روایت بیان کی گئی ہے، ابن اسحاق نے بھی اِسے نقل کیا ہے، اور حاکم اور موسیٰ بن عقبہ نے تصریح کی ہے کہ یہ واقعہ حضرت عُروَہ نے خود اپنے والد ماجد حضرت زبیر بن العوّام سے سُنا تھا، کہ مسلمان روز صبح کے وقت نکل کر مکّے کے راستے پر بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک دھوپ کی تپش ناقابلِ برداشت نہ ہو جاتی، پھر اپنے گھروں کو پلٹ جاتے تھے۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مہاجرین آپ کی آمد میں دیر لگنے سے پریشان تھے۔ ہر روز وہ اور انصار حَرَّۃُ العُصبَہ[1] پر جا بیٹھتے اور دھوپ

۱؎ حَرَّہ لاوے سے جلی ہوئی سیاہ چٹانوں کو کہتے ہیں۔ مدینہ کے نواح میں ہر طرف یہ چٹانیں پائی جاتی ہیں حَرَّۃُ العُصبَہ اُس حَرّے کا نام ہے جو قُبا کے باہر مکہ کے راستے پر پایا جاتا ہے۔ اُسے حَرَّۃِ قُبا بھی کہتے ہیں۔

چڑھنے تک انتظار کرتے رہتے تھے۔ ابن جریر اور ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے عبدالرحمٰن بن عُوَیم بن ساعدہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مجھے میری قوم کے متعدد صحابہ نے بتایا کہ حضورؐ کے مکہ سے نکلنے کی اطلاع پاتے ہی ہم لوگ آپ کی آمد کا انتظار کرنے لگے تھے۔ ہر روز صبح کو ہم اپنے حرّے پر چلے جاتے اور اس وقت تک راہ دیکھتے رہتے جب تک دھوپ ہمیں کا ٹھنے نہ لگتی اور کہیں سایہ باقی نہ رہتا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا، اس لیے ہم لوگ دوپہر کے قریب اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ بزّار نے حضرت عمرؓ سے بھی یہی بات روایت کی ہے۔

یہ اِس بات کی اوّلین علامت تھی کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنا محبوب وطن چھوڑ کر کسی پناہ گزین کی طرح ایک نئی جگہ تشریف نہیں لے جا رہے تھے، بلکہ اللہ کے فضل سے آپ کو مقامِ ہجرت وہ ملا تھا جہاں کے لوگ آپ کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے بے تاب تھے۔

آپؐ کا قُبا پہنچنا دوپہر کا وقت تھا اور لوگ حضورؐ کا انتظار کر کے گھروں کو جا چکے تھے، تب آپ اپنے ساتھیوں کی معیّت میں قُبا پہنچے جو مدینے کی نواحی بستیوں میں سے مشہور ترین بستی ہے۔ قُبا میں آپ کی تشریف آوری کے متعلق دو روایتیں ہیں جو بظاہر مختلف نظر آتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ حرّہ (یعنی حرّۃِ قُبا) کے قریب پہنچ کر اُس کے ایک جانب اُتر گئے اور انصار کو اطلاع دینے کے لیے کسی کو بھیجا۔ یہ خبر پاتے ہی لوگ آئے اور انھوں نے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو سلام کر کے عرض کیا آپ اطمینان سے تشریف لے چلیں ہم سب آپ کے تابع فرمان ہیں۔ یہ بخاری میں حضرت انس کی روایت ہے اور ابن سعد نے بھی اس کو انہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ مُسند احمد اور بیہقی میں حضرت انس کی جو روایت آئی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ حضورؐ کی تشریف آوری کی خبر سُنتے ہی ۵۰۰ آدمی استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جب حضورؐ قُبا کے قریب پہنچے تو ایک یہودی نے، جو اپنی گڑھی کے اُوپر چڑھا ہوا تھا، آپ کو آتے دیکھ کر انتہائی بلند آواز سے پکار کر کہا "اے بنی قَیلَہ، یہ تمہارے سردار آ پہنچے[1]" یہ سُنتے ہی بنی عَمرو بن عَوف نے، جو قُبا میں آباد تھے، بیک زبان نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ہتھیاروں

[1] اَوس اور خزرج چونکہ ایک ماں کی اولاد تھے جس کا نام قَیلَہ تھا اس لیے ان کو بنی قَیلَہ کہا جاتا تھا۔ یہودی کا یہ اعلان کہ تمہارے سردار آ پہنچے، صاف ظاہر کرتا ہے کہ مدینے کے مومن، مشرک، یہودی، (باقی برصفحہ ۱۹)

سے سج کر آپؐ کے استقبال کے لیے چل پڑے۔ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اپنی سواریوں سے اُتر کر کھجور کے ایک درخت کے سایے میں تشریف فرما ہو گئے۔ انصار کا ہجوم بڑے جوش و خروش کے ساتھ آپ کے مقامِ نزول پر حاضر ہوا۔ جذبۂ بے اختیار کی وجہ سے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ مگر وہ جانتے نہ تھے کہ دونوں صاحبوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ اس بناء پر اوّل اوّل وہ حضرت ابوبکرؓ کو سلام کرتے رہے۔ پھر جب دھوپ حضورؐ تک پہنچنے لگی تو حضرت ابوبکرؓ نے اُٹھ کر اپنی چادر سے آپ پر سایہ کیا۔ اُس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضورؐ کون سے ہیں اور لوگ آپؐ کو سلام کرنے لگے۔ یہ روایت امام بخاری نے حضرت عُروہ بن زبیر سے، محمد بن اسحاق نے عبدالرحمٰن بن عُوَیم بن ساعدہ سے، اور ابن سعد نے واقدی سے نقل کی ہے۔ حاکم، موسیٰ بن عُقبہ، ابن جریر طبری اور بَلاذُری وغیرہم نے بھی یہی واقعہ بیان کیا ہے۔

ان دونوں روایات میں بظاہر جو اختلاف نظر آتا ہے وہ درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف حضورؐ نے وہاں پہنچ کر عامر بن فُہَیرہؓ یا عبداللہ بن اُرَیقط کو اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے بھیج دیا ہوگا۔ اور دوسری طرف آپ کو دیکھ کر اُس یہودی نے بھی پکار دیا ہوگا کہ آپ تشریف لے آتے ہیں۔

قُبا پہنچنے کی تاریخ حضورؐ کے قُبا پہنچنے کی تاریخ میں راویوں کے بیانات بہت مختلف ہیں۔ ابن سعد نے ایک جگہ پیر کا دن اور ۲ ربیع الاوّل لکھنے کے بعد ۱۲ ربیع الاوّل کو ایک کمزور قول کی حیثیت سے بیان کیا ہے، اور دوسری جگہ انہوں نے غارِ ثَور سے آپؐ کی روانگی کی تاریخ ۴ ربیع الاوّل اور مدینہ پہنچنے کی تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل قطعیت کے ساتھ لکھی ہے۔ بخاری میں حضرت عُروَہ بن زبیر کی روایت تاریخ کا تعین نہیں کرتی بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ پیر کا دن تھا اور ربیع الاوّل کا مہینہ۔ موسیٰ بن عُقبَہ نے امام زُہری کے حوالے سے یکم ربیع الاوّل قُبا پہنچنے کی تاریخ بیان کی ہے، حالانکہ راویوں کی عظیم اکثریت اُسے مکّہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) سب پہلے ہی سے جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ انصارِ مدینہ کے فرمانروا اور حاکم مقتدر کی حیثیت سے تشریف لا رہے ہیں۔ یہودی کا یہ اعلان مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ہم نے صرف ایک روایت کے الفاظ لے لیے ہیں کیونکہ سب کو نقل کرنا طولِ لاحاصل ہے۔

نکلنے کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ جریر بن حازم کی روایت ابن اسحاق سے یہ ہے کہ آپ ۲ ربیع الاوّل کو قُبا پہنچے تھے، مگر طبرانی نے عاصم بن عدی، اور ابن ہشام، ابن جریر، اور ابراہیم بن سعد نے ابن اسحاق کی جو روایت نقل کی ہے اس میں ۱۲ ربیع الاوّل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بلاذری اور ابن قُتَیْبَہ نے لکھا ہے کہ یہی صحیح تاریخ ہے۔ ابن القیّم نے زادُ المعاد میں اور ابن عبد البرؒ نے الدُّرَر میں بھی یہی تاریخ بیان کی ہے۔ بعض روایات ۸ اور ۱۳ اور ۱۵ ربیع الاوّل کی بھی ہیں۔ لیکن صحیح و معتبر بات یہی ہے کہ حضورؐ یکم ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کی رات کو مکّہ سے نکل کر غارِ ثور میں تشریف لے گئے۔ تین شب و روز وہاں رہے، ۴ ربیع الاوّل کو رات کے آخری حصّے میں مدینے کے لیے روانہ ہوئے، اور ۱۲ ربیع الاوّل کو دوپہر کے وقت وہاں پہنچ گئے[۱]۔ شمسی حساب سے یہ تاریخ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔

قُبا میں قیام

یہ بات متفق علیہ ہے کہ قُبا میں حضورؐ کا قیام قبیلۂ اَوس کی ایک شاخ بنی عَمرو بن عوف کی بستی میں رہا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ وہاں آپ کی میزبانی کا شرف حضرت کُلثُوم بن ہِدمؓ[۲] کو حاصل ہوا۔ اگرچہ بعض اقوال یہ ہیں کہ آپ حضرت سعد بن خَیْثَمہ کے ہاں ٹھیرے تھے، لیکن ابن سعد اور بلاذری نے واقدی کے حوالے سے اور ابن جریر و ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے تصریح کی ہے کہ دراصل

---

[۱] واضح رہے کہ قمری حساب سے رات، دن سے پہلے ہوتی ہے اور سورج غروب ہونے کے بعد نئی تاریخ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے یکم ربیع الاوّل کی رات سے مراد دن سے پہلے والی رات ہے نہ کہ دن کے بعد والی رات۔ نیز یہ بھی معلوم رہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں جب ہجری تاریخ کی ابتداء کی گئی تو ہجرت کے روز سے نہیں بلکہ یکم محرم (مطابق ۱۶ جولائی ۶۲۲ء) سے اس کا آغاز کیا گیا تھا، کیونکہ اہلِ عرب قدیم زمانے سے محرم ہی کو سال کا پہلا مہینہ مانتے چلے آرہے تھے۔ اس لیے ہجرت سنہ ہجری کے تیسرے مہینے میں ہوئی۔

[۲] یہ ایک سن رسیدہ بزرگ تھے۔ حضورؐ کی تشریف آوری کے تھوڑی مدت بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ابن جریر کا بیان ہے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ پہلے شخص تھے جن کا ہجرت کے بعد انتقال ہوا۔ نہ معلوم یہ بات کس طرح بعض روایات میں آگئی ہے کہ حضورؐ کے قیام کے زمانہ میں یہ مشرک تھے۔ استیعاب میں ابن عبد البرؒ اور اِصابہ میں ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ ہجرت سے پہلے یہ مسلمان ہو چکے تھے۔

قیام تو کلثومؓ بن ہدم کے ہاں تھا، لیکن حضورؐ لوگوں سے ملاقات کے لیے حضرت سعدؓ بن خَیثمہ کے ہاں تشریف فرما ہوتے تھے، کیونکہ وہ بال بچوں والے نہ تھے اور ان کا پورا گھر مردوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔ اسی بناء پر لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ آپ حضرت سعد کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ بلاذری نے فتوح البُلدان میں بھی بعینہٖ یہی بات اس صراحت کے ساتھ لکھی ہے کہ میں نے حدیث اور سیرت اور مَغازی کا علم رکھنے والوں کی ایک جماعت سے یہ بات سُنی ہے۔

اِسی قیام کے زمانہ میں آپؐ نے مسجد قُبا کی تعمیر فرمائی جیسا کہ امام بخاری نے حضرت عُروہ بن زبیر سے اور ابن ہشام و ابن جریر نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے اس کے متعلق ابن اسحاق کی پوری سند درج کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ پہلی مسجد تھی جو اسلام میں بنائی گئی اور پہلی مسجد تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو عَلانیہ نماز باجماعت پڑھائی[1]

اسی زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ سے حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور آپؐ کے ساتھ ہی کُلثومؓ بن ہدم کے ہاں قیام کیا۔ ابن ہشام اور ابن جریر نے محمد بن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ وہ مکہ میں تین دن ٹھیرے اور اہل مکہ کی وہ تمام امانتیں واپس کیں جو حضورؐ کے پاس رکھی ہوئی تھیں اس کے بعد انھوں نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ قبا میں حضورؐ کا قیام کتنے دن رہا۔ بخاری و مسلم اور ابن سعد میں حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ آپ وہاں ۱۴ روز رہے۔ واقدی نے بھی ۱۴ دن ہی زمانۂ قیام بتایا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور عُروَہ بن زبیر سے منقول ہے کہ دس سے چند روز زیادہ قیام رہا۔ بنی عَمرو بن عَوف کے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حضورؐ وہاں ۱۸ روز ٹھیرے۔ موسیٰ بن عُقبَہ کی روایت امام زُہری اور مُجمِّع بن یزید بن حارثہ سے یہ ہے کہ آپ ۲۲ دن وہاں رہے، اور یہی زُبَیر

---

[1] مسجد قُبا اب بھی مدینہ طیبہ کے جنوب مغرب میں موجود ہے۔ اُس کے قبلے سے متصل جس مقام پر اب ایک قُبہ ہے "مقام العمرہ" کے نام سے معروف ہے، یہی حضرت کلثوم بن ہدم کا مکان تھا اور اس کے قریب دوسرا قبہ جو مسجد سے متصل ہے اور بیت فاطمہ کے نام سے معروف ہے، وہ حضرت سعد بن خَیثمہ کا مکان تھا۔

بن بکّار کی روایت ہے جو انہوں نے بنی عَمرو بن عوف کے متعدد لوگوں سے سُنی۔ بلاذری نے ایک قول ۲۲ دن کا بھی نقل کیا ہے۔ لیکن ابن سعد، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن جریر، بلاذری اور ابن حبّان نے قطعیّت کے ساتھ کہا ہے کہ حضورؐ نے قُبا میں پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو قیام فرمایا، اور جمعہ کے روز آپ وہاں سے مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہی قول مَغازی وسِیَر کے علماء میں مشہور ہے۔ اگرچہ ابن حبّان نے قبا میں حضورؐ کا قیام تین دن بیان کیا ہے، اور موسیٰ بن عقبہ نے بھی یہی لکھا ہے، مگر دراصل انہوں نے آپ کے قبا پہنچنے اور قبا سے روانہ ہونے کے دنوں کو زمانۂ قیام میں شمار نہیں کیا ہے، اس لیے ان کا قول بھی قولِ مشہور کے مطابق ہے۔

قبا سے روانگی اور پہلی نمازِ جمعہ ابن ہشام اور ابن جریر نے ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے، اور یہی ابن سعد اور بلاذری کی روایت بھی ہے کہ حضورؐ جمعہ کے روز دن چڑھے قُبا سے روانہ ہوئے۔ بنی سالم بن عوف کی بستی میں پہنچے تھے کہ نمازِ جمعہ کا وقت آگیا۔ آپؐ وہاں اُترے اور اُن کی مسجد میں جمعہ پڑھایا۔ ۱۰۰ آدمی اس نماز میں شریک تھے، اور یہ پہلا جمعہ تھا جو حضورؐ کی امامت میں پڑھا گیا۔ بنی سالم کی یہ مسجد وادیِ رانُونا میں تھی[۵] اور پہلے مسجد غُبَیب کہلاتی تھی، پھر حضورؐ کے وہاں جمعہ پڑھانے کے بعد مسجد جمعہ کے نام سے مشہور ہو گئی اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ مدینہ سے قُبا جاتے ہوئے یہ راستہ کے بائیں جانب ملتی ہے۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اسے سعید بن عبدالرحمٰن الجُمَحِی کے حوالہ سے ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں لفظ بلفظ درج کیا ہے۔ لیکن اس میں قرآن مجید کی بعض ایسی آیات پائی جاتی ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں، اس لیے یہ امر مشتبہ ہے کہ حضورؐ کی طرف جو خطبہ منسوب کیا گیا ہے وہ صحیح الفاظ میں نقل ہوا ہے یا نہیں۔

مدینہ میں داخلہ نمازِ جمعہ کے بعد جب حضورؐ مدینے جانے کے لیے تیار ہوئے تو بنی سالم کے لوگ

۵۔ یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں لفظ رانُونا کے تحت لکھا ہے کہ وادی رانوناء میں اس مسجد کے وقوع کا ذکر ابن اسحاق کی سیرت کے اُس خلاصے میں آیا ہے جو ابن ہشام نے کیا ہے، ورنہ دوسرے سب صرف یہ لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے بنی سالم کی بستی میں نمازِ جمعہ ادا کی۔

حضرت عِتبان رضی اللہ عنہ بن مالک اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عُبادہ بن نضلہ کی سربراہی میں سامنے آئے اور آپؐ کی اُونٹنی کی نکیل تھام کر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ ہمارے ہاں قیام فرمائیں، ہم تعداد میں بھی کافی ہیں، جنگی سروسامان بھی رکھتے ہیں اور دفاع کی طاقت بھی۔ حضورؐ نے فرمایا، میری اُونٹنی کا راستہ چھوڑ دو، کیونکہ یہ مامور ہے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت چل رہی ہے اور اُسی جگہ جاکر ٹھیرے گی جہاں ٹھیرنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ آگے چلے تو بنی بیاضہ، بنی ساعدہ، بنی الحارث، بنی عَدِی بن نجّار کے محلے راستے میں آئے۔ ہر جگہ اِن قبیلوں کے لوگ اپنے سرداروں کی پیشوائی میں سامنے آکر اپنے ہاں قیام کے لیے عرض کرتے رہے، اور آپ ان سب کو یہی جواب دیتے رہے کہ میری اُونٹنی کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ یہ مامور ہے۔ حضورؐ نے اُس کی نکیل ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی اور آپؐ اسے کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں فرما رہے تھے کہ وہ کدھر جائے اور کہاں ٹھیرے۔ جب وہ بنی مالک بن نجّار[1] کے محلے میں پہنچی تو ٹھیک اُس جگہ جاکر بیٹھ گئی جہاں آج مسجد نبوی اور بعض روایات کے مطابق منبرِ رسولؐ ہے۔ مگر حضورؐ اُس پر تشریف فرما رہے۔ وہ پھر اُٹھی اور کچھ دُور چل کر پھر اُسی جگہ پلٹ آئی اور وہاں ٹک گئی۔ تب حضورؐ اُس پر سے اُترے[2]۔ یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جسے ابن ہشام نے تفصیل کے ساتھ اور ابن جریر نے اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

---

[1] یہ وہی خاندان تھا جس کی ایک خاتون سَلمٰی بنت عَمرو سے حضورؐ کے پردادا ہاشم نے شادی کی تھی اور حضورؐ کے دادا عبدالمطلب انہی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اسی خاندان میں عبدالمطلب جوانی کی عمر کے قریب پہنچنے تک پلے بڑھے، اسی خاندان کے لوگ اُس موقع پر عبدالمطلب کی حمایت کے لیے مکّے پہنچ گئے جب اُن کے چچا نے اُن کی میراث مار کھائی تھی، اور اس خاندان سے حضورؐ کے خاندان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ آپ کے والد جناب عبداللہ نے اپنے آخری ایامِ زندگی انہی کے ہاں گزارے، یہیں وہ مدفون ہوئے، اور حضورؐ کی والدہ ماجدہ آپ کو بچپن میں انہی لوگوں سے ملانے کے لیے مدینے لے گئی تھیں۔

[2] اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت تھی کہ اُس نے حضورؐ کی جائے قیام کا انتخاب خود حضورؐ پر نہ چھوڑا بلکہ اپنے حکم کے تحت اُونٹنی سے یہ خدمت لی۔ اگر حضورؐ اپنی پسند سے جائے قیام کا انتخاب فرماتے تو انصار کے دوسرے قبیلوں میں یہ احساس پیدا ہوسکتا تھا کہ آپ نے ہم پر بنی نجّار کو ترجیح دی ہے۔

ابن سعد اور بلاذری نے بھی اسے مختصراً بیان کیا ہے۔

حضرت ابوایوبؓ کے ہاں قیام آگے کی روداد کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ جب حضورؐ اُونٹنی سے اُتر گئے تو سامنے ہی حضرت ابوایوبؓ انصاری (خالد بن زید) کا مکان تھا۔ وہ حاضر ہوئے اور آپ کا سامان اُتار کر اپنے گھر لے گئے اور آپ نے انہی کے ہاں قیام فرمایا۔

بخاری اور مسند احمد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپ نے اُونٹنی سے اُتر کر دریافت فرمایا کہ ہمارے لوگوں میں سے کس کا گھر یہاں سے قریب تر ہے۔ حضرت ابوایوبؓ نے عرض کیا، میرا، یا رسول اللہ، یہ سامنے میرا گھر ہے اور یہ میرا دروازہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "تو جاؤ اور ہمارے لیے قیلولے کا انتظام کرو"۔ ابن سعد نے بھی حضرت انس کے حوالے سے یہی بات لکھی ہے، اور واقدی کے حوالے سے ابن سعد اور بلاذری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضورؐ کی اُونٹنی کو حضرت اسعدؓ بن زُرارہ نے اپنے ہاں لے جاکر باندھ دیا اور وہی اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

بعض روایات میں ہے کہ اونٹنی سے اُتر کر حضورؐ نے فرمایا ھٰذا المنزل ان شاء اللہ "یہی جائے قیام ہے۔ اگر اللہ نے چاہا"۔ حضرت ابوایوبؓ نے آکر عرض کیا کہ میرا مکان یہاں سے قریب ترین ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں آپ کا سامان اپنے ہاں لے جاؤں۔ حضورؐ نے اُن کو اجازت دے دی اور وہ سامان اپنے ہاں اُٹھا کر لے گئے۔ طبرانی نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے یہی بات روایت کی ہے۔

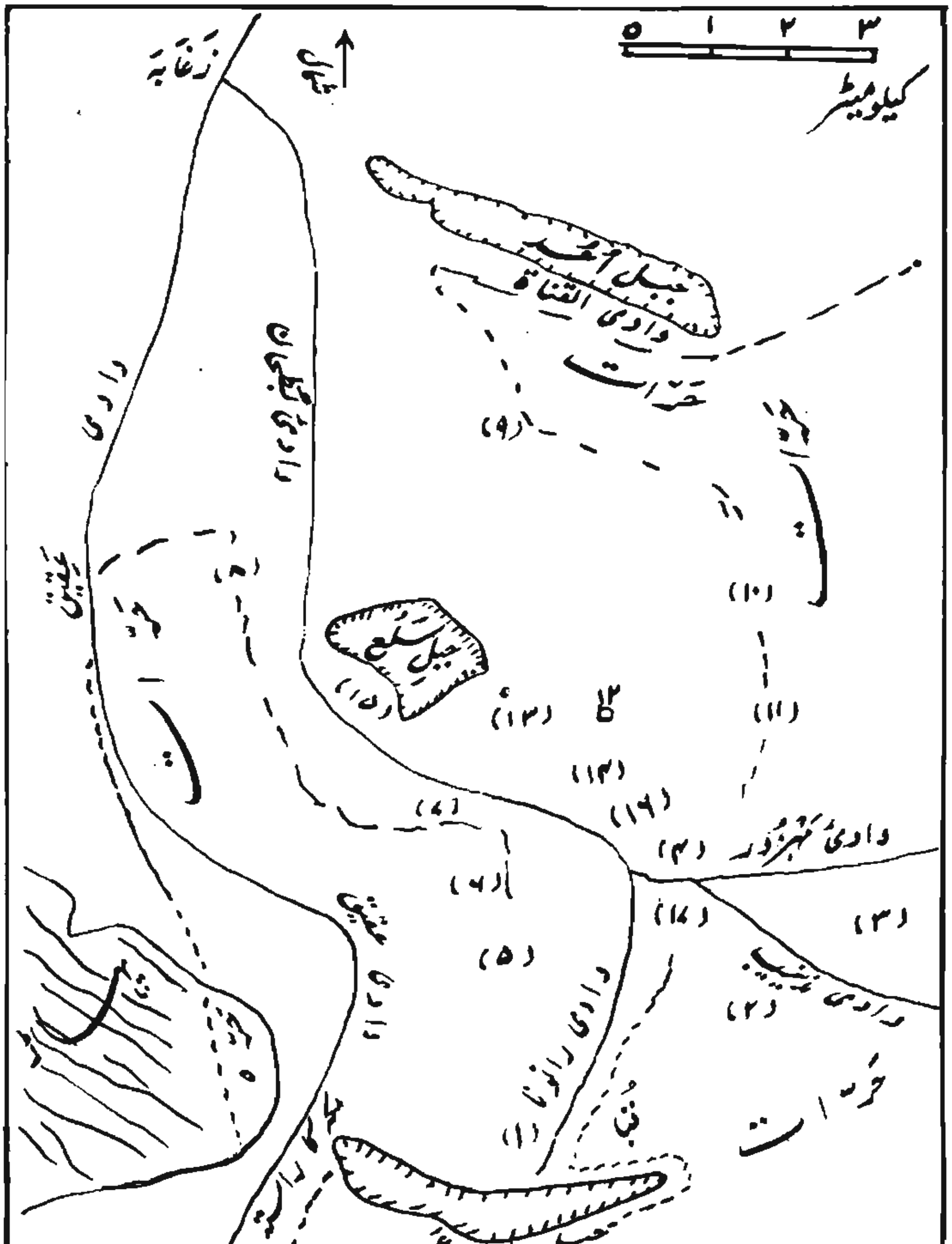
بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ لوگوں میں اس بات پر جھگڑا ہوا کہ آپ کہاں اُتریں، اور آخر کار حضورؐ نے فرمایا آج میں بنی نجار میں ٹھیروں گا جو عبدالمطلب کی ننھیال ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں مسند احمد کے حوالہ سے خود حضرت ابوایوب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جب انصار میں اس بات پر جھگڑا بڑھا کہ حضورؐ کا قیام کہاں ہو تو آخر کار قرعہ ڈالا گیا اور میرا نام نکلا[1]۔

ان مختلف بیانات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے تو حضورؐ حضرت ابوایوبؓ کے ہاں اُتر گئے ہوں گے۔ اور بعد میں آکر دوسرے قبیلوں نے یہ چاہا ہوگا کہ اس شرف میں انہیں بھی حصہ ملے۔ اس پر قرعہ اندازی

[1] حضرت ابوایوبؓ انصاری کا مکان اب بھی مسجد نبوی کے جنوب مشرقی جانب موجود ہے۔ اور اس کے قریب دارِ جعفر الصادق ہے جس میں اب مسجد نبوی کے امام و خطیب رہتے ہیں۔

مدینہ طیبہ بزمانۂ ہجرت



۱۔ بنی عمرو بن عوف
۲۔ بنی نضیر
۳۔ بنو قریظہ
۴۔ بنو قینقاع
۵۔ قواقلہ : بلحبلی
۶۔ بنی عوف
۷۔ بنی بیاضہ
۸۔ بنی سلمہ
۹۔ بنی حارثہ
۱۰۔ بنی عبد الاشہل
۱۱۔ بنی ظفر
۱۲۔ مسجد نبوی
۱۳۔ بنی نجار
۱۴۔ بنی زریق
۱۵۔ بنی ساعدہ
۱۶۔ بلحارث
۱۷۔ اوس مناۃ

کی نوبت آئی ہوگی، اور حضورؐ نے بھی لوگوں کو یہ فرما کر مطمئن کیا ہوگا کہ اِس خاندان میں میری پہلے سے قرابت ہے، کیونکہ اہلِ عرب کے ہاں قرابت کے حق کا مقدم ہونا مسلّم تھا۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الذکر والدعاء میں حضرت ابو ایوبؓ انصاری کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ جب حضورؐ میرے ہاں اُترے تو آپ مکان کے نچلے حصّے میں ٹھیرے اور میں اور ام ایوب کی ماں بالائی منزل میں رہے۔ رات کو میں نے ایوب کی ماں سے کہا کہ حضورؐ اُوپر قیام فرمانے کے زیادہ حق دار ہیں، کیونکہ آپ کے پاس ملائکہ آتے ہیں اور آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس خیال سے نہ میں رات کو سو سکا اور نہ اُمّ ایوب۔ صبح میں نے حضورؐ سے یہ ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا نیچے کا مکان میرے لیے زیادہ آرام دہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ایسے بالاخانے میں نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ قیام فرما ہوں۔ غرض میں نے اتنا الحاح کیا کہ آپ اُوپر کی منزل میں رہنے پر راضی ہو گئے۔

ابن ہشام نے محمد بن اسحاق سے حضرت ابو ایوب کی جو روایت نقل کی ہے وہ اِس سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ اس میں یہ ہے کہ حضورؐ نے نیچے کے حصّے کو پسند کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس میں آپ کے پاس حاضر ہونے والوں کے لیے زیادہ سہولت ہے۔ اس لیے حضرت ابو ایوبؓ بادلِ نخواستہ اُوپر کی منزل میں رہنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن ایک روز ایسا ہوا کہ اُوپر کی منزل میں پانی کا ایک برتن ٹوٹ گیا۔ حضرت ابو ایوبؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پانی ٹپک کر نیچے نہ گر جائے اور اس سے حضورؐ کو تکلیف ہو۔ اس لیے دونوں میاں بیوی کے پاس جو ایک ہی لحاف تھا اس کو انہوں نے پانی میں ڈال کر جلدی جلدی اُسے خشک کیا۔ بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے بھی حضرت ابو ایوبؓ سے یہ واقعہ اسی طرح روایت کیا ہے۔

ابن سعد نے حضرت زید بن ثابت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ کے ہاں حضورؐ کے قیام کے زمانے میں کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا جب تین چار گھروں کے لوگ آپؐ کے دروازے پر خوان لیے ہوئے کھڑے نہ نظر آتے ہوں۔

مدینہ میں آپؐ کا استقبال | اگرچہ اُوپر کے بیان سے بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ مدینہ نے کس عقیدت و محبت کے ساتھ آپؐ کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ لیکن شہر میں آپ کا استقبال جس جوش و خروش اور جس والہانہ انداز میں ہوا وہ بے نظیر تھا۔ عرب میں نہ اس سے پہلے کبھی کسی کا ایسا استقبال ہوا تھا نہ اس کے بعد ہوا۔ (باقی)

نسوانی حقوق کی تحریکات

اُن کے محرّکات اور ان کے ثمرات

(جناب ملک غلام علی صاحب)

ترجمان کے صفحات میں حکومت کی قائم کردہ "حقوق نسواں کمیٹی" کی رپورٹ پر ہمارا تبصرہ و تجزیہ خاصا طویل ہو چکا ہے۔ تاہم اس بحث کے بعض اہم پہلو ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔ اب تک کی گفتگو میں جو چیز پیشِ نظر رہی ہے وہ یہ ہے کہ بات کو بہت زیادہ نہ پھیلایا جائے اور کمیٹی نے اپنی سفارشات کا جو حصہ دفعات کی شکل میں مرتب کیا ہے، بحث و نظر کو حتی الامکان اسی تک محدود رکھا جائے۔ لیکن اِس رپورٹ کی پشت پر جو عمرانی و تمدنی نظریات کارفرما ہیں اور جن کے برگ و بار ان نظریات کے قائلین و عاملین کو اپنا ذائقہ چکھا چکے ہیں، جب تک ان کی کچھ تفصیل نہ بیان کی جائے، تصویر کا اصل رُخ سامنے نہیں آتا۔ اس لیے اس پس منظر و پیش منظر کی بھی تھوڑی سی توضیح یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس نوعیت کی سفارشات اس کمیٹی نے کی ہیں کوئی حقیقی اجتماعی یا تمدنی ضرورت ان کے لیے داعی نہیں تھی، نہ اُن سے کسی بے انصافی کا ازالہ یا خرابی کی اصلاح مطلوب و متوقّع ہے، بلکہ اصل مقصود جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ مغرب میں عورت تن تنہا یا مرد کے ہمراہ جن جن راہوں اور اونچی نیچی گذرگاہوں میں بھٹک رہی ہے پاکستان کی مسلمان خاتون بھی ضرور ان سب راستوں پر رواں دواں اور سرگرداں ہو اور اسی انجام سے دوچار ہو جس سے مغربی دُنیا کی عورت دوچار ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ میں جتنی بھی سفارشات اہم اور دُور رس نتائج کی حامل ہیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے مغرب کے معاشرے میں آزمایا نہ جا چکا ہو اور جس کے تلخ ثمرات سے وہاں کے کام و دہن اور قلب و دماغ کو پوری طرح سیری نہ حاصل ہو چکی ہو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ اس قسم کے تجربات دہرانا چاہتے ہیں وہ ان نتائج و عواقب

سے بے خبر ہیں یا باخبر تو ہیں مگر جان بوجھ کر وہی صورتِ حال اپنے ہاں پیدا کرنا چاہیے ہیں جو مغرب میں رونما ہو چکی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب زدہ طبقے کی ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت، خواہ وہ پڑھے لکھے افراد ہوں یا اَن پڑھ ہوں، خواہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، اگرچہ ان پر سے مذہب و اخلاق کی گرفت ایک حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن ان کے عادات و اطوار آخری حد تک نہیں بگڑے اور بفضل اللہ وہ دین و دانش سے بالکل بے بہرہ نہیں ہو چکے۔ اس لیے اگر انہیں بتایا جائے کہ مغرب کے صنعتی انقلاب اور فرانس اور روس کے خوں آشام حوادث و اضطرابات نے مساوات، حریت وغیرہ کے جو کھوکھلے اور گمراہ کن نعرے ایجاد کیے تھے اور ان کے بل پر جس جنتِ ارضی کو وجود میں لانے کے دعوے اور وعدے کیے تھے وہ سب کے سب سراب سے بھی زیادہ بے حقیقت ثابت ہوئے اور بالآخر انہوں نے رُوئے زمین کو جہنم زار بنا کر رکھ دیا، تو ہمیں اُمید ہے کہ مسلمان اس سے عبرت و موعظت حاصل کریں گے۔ اسی اُمید پر ہم چاہتے ہیں کہ مغرب کے بعض اہل فکر کی کچھ نگارشات ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں نقل کریں اور ان کی وساطت سے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

سب سے پہلے ہم یونیورسل لائبریری کی شائع کردہ ایک کتاب کے چند اقتباسات دیں گے جس کتاب کا نام "خاتونِ جدید۔ جنسِ گم گشتہ" (MODERN WOMAN — THE LOST SEX) ہے۔ اس کتاب کے متعلق پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسے ایک مرد اور عورت نے مل کر تصنیف کیا ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ "محض مردانہ یا محض زنانہ نقطۂ نظر" کی حامل ہے۔ یہ کتاب بڑی حد تک ایک متوازن، غیر جانبدارانہ اور معروضی زاویۂ نگاہ سے مرتب کی گئی ہے۔ مرد مؤلف کا نام فرڈی نند لنڈ برگ ہے جو صحافی، ماہر معاشیات، مؤرخ اور سوانح نویس (بیاگرافر) ہیں اور سوشل ہسٹری اور سیاسیات میں لیکچرر ہیں۔ عورت کا نام مرینیا ایف، فارن ہیم ہے جو ایم۔ ڈی ہیں اور نفسی و اعصابی امراض کی ماہر طبیبہ ہیں، پرائیویٹ علاج کرتی ہیں، نیز نیو یارک کے ایک سرکاری ہسپتال سے منسلک ہیں، لندن اور وائنا کے ہسپتالوں میں بھی تعلیم و تربیت لے چکی ہیں اور صاحبۂ اولاد ہیں۔ یہ کتاب قریب پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آغاز اور ابوابِ مابعد میں جابجا "نظریۂ مساواتِ مرد و زن"

کا ابطال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت کو ہر حیثیت سے مساوی قرار دینے کے کتنے مہلک نتائج نکلے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۳ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"عورت کا وجود مرد کے مقابلے میں پیچیدہ تر ہے۔ عورتوں کو قدرت نے توالد و تناسل کا ایک نازک اور دقیق نظام جسمانی ودیعت کیا ہے جو مرد سے قطعی غیر مشابہ ہے۔ عورت کا اعصابی اور نفسیاتی نظام بھی بہت پُرپیچ اور عمیق ہے جو پورے کا پورا وظیفۂ ولادت کے گرد گھومتا ہے جس طرح ایک خطِ مستقیم اور ایک قوس اور مدوّر کمانی میں کوئی مشابہت نہیں، اسی طرح ایک مرد اور عورت میں بھی کوئی باہمی مشابہت نہیں۔"

اس کے بعد صفحہ ۴-۵ پر دکھایا گیا ہے کہ روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد نسوانی تحریک FEMINISM بڑے زور شور سے چلی اور عورتوں کے معاملے میں ہر طرح کی بے قیدی اور اباحیت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد یک لخت اس پالیسی میں تغیر رونما ہوا۔ آزاد اور غیر رسمی شادیوں پر قدغن لگائی گئی، طلاق کے حصول کو عملاً ناممکن بنا دیا گیا، اسقاطِ حمل کو ناجائز سمجھا گیا، بچوں سے محروم عورت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا، اور عائلی زندگی کی خوبیوں اور تقدیس کے سرکاری طور پر گُن گائے گئے۔

صفحہ ۱۰ پر ماڈرن عورت کی حالتِ زار ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"زمانۂ جدید کی عورت سے اس درجہ متضاد مطالبات کیے گئے ہیں کہ وہ تفکرات اور اُلجھنوں کا ایک بنڈل بن کر رہ گئی ہے۔ جب تک اس کی جان میں جان ہے، وہ متنوع مصروفیات کے دوران میں شدید مسابقت اور مقابلہ سے دوچار ہے۔ آج کے دور میں وہ گھر سے نکل کر باہر کی دنیا میں آ کھڑی ہوئی ہے۔ اسے خارجی ماحول میں گھسیٹ لانے کا باعث ایک تو صنعتی اور مشینی انقلاب ہے اور دوسری وجہ وہ دانشور اور نظریہ پرست ہیں جو اُسے کشاں کشاں اس میدان میں لے آئے ہیں جہاں اس کے لیے مقابلہ ناگزیر ہے اور یہ مقابلہ اب مردوں سے زیادہ خود عورتوں کے ساتھ درپیش ہے۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ اُسے اپنے شوہر کے معاملے میں کامل اعتماد تھا اور جدائی کا امکان کم ہی تھا۔ لیکن اب اُسے معلوم ہے کہ کئی عورتیں جو اسٹینوگرافر یا سکرٹری ہیں، ہیٹ چیک کرنے والی یا ماڈل بننے والی لڑکیاں ہیں، یا فیشن کے ڈیزائن تراشتی ہیں یا ویسے ہی مرد کو گھورتی پھرتی ہیں۔ یہ سب

کی سب شادی شدہ عورت کے شوہر کی تاک میں ہیں اور اسے چھین لینا چاہتی ہیں۔ افسانے، ناول، سنیما کا یہی موضوع ہے کیونکہ عالمِ واقعات میں یہی کچھ رونما ہو رہا ہے۔ اگر اس کا شوہر نہیں ہے اور اُسے رفیقِ حیات کی تلاش ہے تو وہ یہ جانتی ہے کہ جس چیز کی اُسے تلاش ہے، اور بہت سی عورتیں بھی اُسی کے پیچھے ماری ماری پھر رہی ہیں۔ عورتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، وہ کسی جگہ محفوظ و مصئون نہیں بلکہ ان کے غول کے غول شکار کرنے اور شکار بننے کے لیے چارسُو آوارہ پھر رہے ہیں۔ یہ عورتیں چونکہ بآسانی دستیاب ہیں اور جنسی اخلاق سے عاری ہیں، اس لیے مرد اُن کے ساتھ کوئی آخری عہد کرنے اور نباہنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اس لیے عورتیں اپنے اندر زیادہ سے زیادہ کشش پیدا کرنے اور بناؤ سنگار مہیا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ دوسری طرف تلاشِ معاش میں عورتوں کے بالمقابل عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ یہ مقابلہ نہایت بے رحم اور جان لیوا ہوتا ہے۔ دفتروں اور کارخانوں کی سیاسیات میں افسری و ماتحتی کے عنصر کے ساتھ ساتھ مردانہ و زنانہ سیاسیات کا بھی دخل ہو جاتا ہے۔ ایسا سخت ہمہ جہتی مقابلہ عورت کو ہر لحظہ مبتلائے تشویش رکھتا ہے۔"

تہذیب جدید نے عورت کے اندر جو اس طرح کا ذہنی اضطراب اور اعصابی کھچاؤ پیدا کر دیا ہے، کتاب کے مرتبین کے نزدیک یہ اُن دماغی عوارض، کم سِنی کے جرائم، معاشرے کے خلاف نفرت و بغاوت اور قلبی عدمِ سکون کا بنیادی باعث ہے جو مغربی معاشرے پر تیز رفتاری سے چھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے بعد تیسرے باب کا خاتمہ صفحہ ۸۱ پر ان الفاظ میں ہوتا ہے:

"یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ راحت و مسرت کے روزافزوں فقدان کا سبب غربت، بیماری، جسمانی ناکارگی یا عزیزوں کی فوتیدگی نہیں ہے۔ یہ عوارض تو رنج و الم میں صرف اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ غم و اندوہ دراصل اعصابی اختلال (NEUROSIS) کا نتیجہ اور خارجی مظاہرہ ہے۔ اور اس اعصابی فساد و اختلال کی پیدائش بچپن میں نامناسب اور نامساعد گھریلو ماحول سے ہوتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ عورتیں اور مائیں اس خرابی کی اصل ذمہ دار ہیں"۔

اس کے بعد "گھر کی تباہی" (DESTRUCTION OF THE HOME) کے عنوان سے ایک مستقل باب تحریر کیا گیا ہے جس میں عورت کے گھر سے باہر آنے کے نتائج کو مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں:-

" صنعتی انقلاب کے ہتھوڑے نے عورت کو مزبین لگا لگا کر گھر سے نکالا اور مرد کے مشاغل میں عورت کو بھی منہمک کر دیا حالانکہ گھر وہ مقام تھا جہاں عورت نے تہذیب و تمدن کے آغاز سے لے کر اب تک اپنا بہترین مادی و جذباتی سرمایہ لگایا تھا۔ گھر کی تباہی نے صرف عورت ہی کو ناخوش و بے قرار نہیں کر دیا بلکہ پوری سوسائٹی اس سے متاثر ہوئی ہے۔ ایک عمومی ابتری اور افراتفری کے لیے اسٹیج تیار ہو چکا ہے جس کے نتائج ہم سب بھگت رہے ہیں۔ دماغی امراض اور اعصابی عوارض کے مریض جتنی کثیر تعداد میں اب پائے جاتے ہیں تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں مل سکتی "

" آج کا گھر گھر نہیں بلکہ محض ایک رہائش گاہ ہے۔ بعض اسے ایک تغیر پذیر گھر قرار دیتے ہیں مگر یہ محض ایک خوش فہمی اور خیال آفرینی ہے۔ ماڈرن گھر کوئی نشو و نما دینے والا ادارہ نہیں بلکہ سماجی نقطہ نظر سے ایک تخریبی آلہ ہے۔ چنانچہ حاکمانہ طاقتیں اور ایجنسیاں اپنے صحیح یا غلط نظام اجتماعی کے تحفظ کی خاطر ان جدید گھروں کو خود شبہ کی نگاہ سے دیکھتی اور گھر کے افراد کی مخفی جگہ کڑی نگرانی کر رہی ہیں۔ ان گھروں میں جو بے اطمینانی اور بے چینی جنم لے چکی ہے اور مزید اجتماعی بدنظمی کے لیے انڈے بچے دے رہی ہے، حکومتیں خواہ کتنی بھی جاسوسی کریں وہ اس کی روک تھام کے لیے ناکافی ہی ہوگی۔ یہاں جذباتی پن کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا سامنا کرنا ناگزیر ہے"۔

اس کے بعد کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس زمانے میں گھر بس سٹاپ یا مسافر خانہ بن کر رہ گئے ہیں جہاں گھر کے افراد فقط نہانے یا سونے کے لیے آتے ہیں، ورنہ دن رات کے بیشتر اوقات ایسے ہوتے ہیں جہاں گھروں میں سناٹا ہوتا ہے، البتہ تھیٹر، قہوہ خانے، شراب خانے، ریسٹوران، رقص گاہیں اور لہو و لعب کے مراکز رات دن آباد رہتے ہیں۔ پھر یہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کے اندر سے بیوی یا ماں بن کر رہنے کا رجحان تیزی سے غائب ہوتا چلا جا رہا ہے اور بچوں کی پیدائش و پرورش کی قدر و قیمت عورت بلکہ پورے معاشرے کی نگاہوں سے گر گئی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۲۴ پر اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں دیا گیا ہے:۔

" چرچ اور ریاست نظریاتی اعتبار سے تو وظیفہ مادری (MOTHER HOOD) کی بڑی مدح سرائی کرتے ہیں، لیکن ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ماں بننا اب عورت کو باعث منفعت

نظر نہیں آتا۔ اُس کے ساتھ اب کوئی مرتبہ و منزلت وابستہ نہیں ہے۔ جس طبقے کے ہاتھ میں ذہنی و فکری قیادت ہے اور جو سوچ بچار کے پیمانے فراہم کرتا ہے وہ اب بچے جننے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جو عورت بچے کے جھنجٹ سے آزاد ہو مگر مجلس قانون ساز کی ممبر، ایڈیٹر، انشا پرداز، ایکٹریس، ملازم، کاروباری ادارے کی منتظمہ یا معلّمہ ہو، سوسائٹی اس کا احترام اُس عورت سے زیادہ کرتی ہے جو محض ماں بن کر گھر کی چار دیواری میں رہے۔ آج کل کی عورت کے لیے بے شمار نفسیاتی مشکلات ہیں، لیکن سب سے زیادہ عمیق مشکل اس کے لیے اولاد پیدا کرنا ہے۔ طبّی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے تو حالات اُس کے لیے نہایت سازگار ہیں لیکن ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے عورت کی راہ میں شدید رکاوٹ حائل کر دی گئی ہے۔ برتھ کنٹرول کے حامی بچوں کی پیدائش کو ہمیشہ ایک معاشی آفت بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں جس سے عورت کے ایک فطری فریضے کی بجا آوری میں رکاوٹ اور خلل رونما ہوتا ہے اور اس سے محرومی اُسے دماغی و نفسیاتی امراض کا شکار بنا دیتی ہے"۔

ضبطِ ولادت کی تحریک کا جواز ابتدا میں اس بنیاد پر فراہم کیا گیا تھا کہ نسل انسانی جس رفتار سے کرۂ زمین پر بڑھ رہی ہے اس رفتار سے انسانی غذا زمین پر پیدا نہیں کی جا سکتی، اس لیے تحدیدِ نسل ناگزیر ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نظریہ اور مفروضہ ہے جو تازہ ترین دریافت شدہ حقائق اور معلومات کی بنا پر صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں ضبطِ ولادت کے لیے جتنے بھی آلات، تدابیر اور دوائیں ایجاد ہو سکی ہیں ان کا مضرِ صحت ہونا بھی شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہا۔ لیکن اسقاطِ حمل اور ضبطِ تولید چونکہ جنسی آوارگی و بے قیدی کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے، اس لیے مغربی تہذیب کے دلدادہ مشرقی اور ایشیائی ممالک میں بھی اسے زبردستی رائج کرنے پر مصر ہیں خواہ کوئی قوم اس پر آمادہ ہو یا نہ ہو۔ حال ہی میں اندرا گاندھی کو جو انتخابی شکست ہوئی ہے اُس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کا لڑکا جبراً نس بندی اور ضبطِ ولادت اپنے ملک پر ٹھونسنا چاہتے تھے۔ ہمارے حکومتی محکمۂ منصوبہ بندی نے بھی اس پروگرام کو بڑے طمطراق سے شروع کر رکھا ہے۔ جا بجا پبلک مقامات پر بڑے بڑے بورڈ آویزاں ہیں جن میں بے شمار بچوں کے سر دکھائے گئے ہیں اور اُوپر جلی عنوان سے تحریر ہے: "اس سیلاب کو روکیے؟" ایک تصویر میں ایک ٹوکرا اور اس میں ایک درجن بچے دکھائے گئے ہیں اور اسے باپ کی گردن پر لاد کر والدین کو اس بلائے ناگہانی سے ڈرایا گیا ہے۔ یو، این، او، برطانیہ، جرمنی، ناروے، اسٹریلیا، امریکہ سب پاکستان کی آبادی

گھٹانے میں موجودہ حکومت کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، کیونکہ تئیس سال میں پاکستان کی آبادی دگنی ہو جانے کا خطرہ درپیش ہے ۔ "حقوقِ نسواں کمیٹی" بھی عورتوں کے اس بنیادی حق سے غافل نہیں رہی ہے کہ انہیں اضافہ آبادی کے "تخریبی" کام سے ہٹا کر دوسرے "تعمیری" مردانہ مشاغل میں مصروف کیا جائے ۔ آخر اس کمیٹی کو اسی حکومت ہی نے تو مقرر کیا ہے جو اپنا فخریہ کارنامہ یہ بیان کرتی ہے کہ "پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی عورت کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا ہے"۔ چنانچہ کمیٹی کی رپورٹ کے آخر میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے کچھ نئی قانون سازی بھی تجویز کی گئی ہے ۔ رپورٹ کی دفعہ ۱۱۴ میں کہا گیا ہے :

"خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر کمیٹی کی خاص توجہ رہی ہے کیونکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ خواتین اسی صورت میں زندگی کے تمام شعبوں میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور اپنی معاشرتی اور معاشی حیثیت بلند کر سکتی ہیں جبکہ ہمارے خاندان زیادہ بڑے نہ ہوں ۔ قانون سازی کے پہلو پر کمیٹی حسب ذیل سفارش کرتی ہے :

(الف) عام دوا فروشوں کے لیے قانونی طور پر فرض کیا دیا جائے کہ وہ موانع حمل موجود رکھیں اور مذکورہ فرضِ قانونی کو اس کے لائسنس کی شرط قرار دیا جائے ۔ علاوہ ازیں شفاخانوں اور اسپتالوں میں موانع حمل کا وافر سٹاک شادی شدہ لوگوں میں فوری تقسیم کے لیے موجود رہنا چاہیے ۔

(ب) خاندانی منصوبہ بندی کا مضمون ایم' بی' بی' ایس کے نصاب میں بطور لازمی مضمون شامل کیا جائے ۔

(ج) میڈیکل سند یافتگان، مرد اور عورت دونوں، جو ڈاکٹری کی پریکٹس نہ کر رہے ہوں ان کو منصوبہ بندی کی تربیت دی جانی چاہیے اور ہفتہ میں کم از کم دس گھنٹے خدمت انجام دینے پر مجبور کیا جائے ۔

(د) مردوں کی شادی کی کم از کم عمر ۱۸ سال سے بڑھا کر اکیس سال کر دینی چاہیے ۔"

یہاں ایک نہایت اہم اور انتہائی افسوسناک حقیقت پر سے پردہ اٹھا دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ رپورٹ جب بالکل اپنی آخری شکل میں مرتب ہوئی تو اس میں شفاخانوں اور ہسپتالوں کے ساتھ "گورنمنٹ آفیسز، پرائیویٹ بزنس سنٹرز جہاں دس سے زیادہ افراد کام کرتے ہوں" کے الفاظ بھی موجود تھے، جنہیں عین آخری وقت جب کمیٹی کے چیئرمین نے دستخط کیے ہیں حذف کیا گیا ہے ۔ اسی طرح شادی شدہ لوگوں (MARRIED PERSONS) کے الفاظ رپورٹ کے آخری مسودے میں موجود نہیں تھے، ان کا اضافہ بھی بعد میں ہوا ہے ۔ اگر کسی صاحب کو ہماری بات پر یقین نہ آئے تو

وہ اسی رپورٹ کا وہ متن ملاحظہ کر لیں جو ۹ جولائی ۷۶ء کے روزنامہ "سن" لاہور میں شائع ہوا ہے۔ یہ اُس اصل رپورٹ کی فوٹو کاپی ہے جو اخبار کو مہیا کی گئی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا خط کشیدہ الفاظ مطبوعہ موجود ہیں مگر انہیں قلمزد کر دیا گیا ہے اگرچہ بغور دیکھنے سے ان کو بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک "شادی شدہ" کے الفاظ کا تعلق ہے یہ دفعہ ۱۱۴ میں تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، البتہ چیرمین صاحب نے اپنے قلم سے انہیں آگے چل کر اس غلاصے کی دفعہ ۱۳۱ میں بڑھایا ہے جو رپورٹ کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

آخری مرحلے کی یہ رد و بدل اور حذف و اضافہ عیاں کر رہا ہے کہ ان لوگوں کا بس چلے تو یہ پاکستانی قوم کی شرم و حیا اور عصمت و حمیت کا دیوالہ نکال دینا چاہتے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی ملک یا قوم میں ایسی مثال موجود ہے کہ وہاں کے ہر میڈیکل اسٹور، شفاخانے، گورنمنٹ کے دفتر اور کاروباری ادارے پر لازم کر دیا گیا ہو کہ وہ مانع حمل آلات اور دوائیں ہر کس و ناکس کو فراہم کرتا رہے؟

ضبطِ ولادت کے حامی چونکہ یہ مسلسل باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مانع حمل دوائیں اور گولیاں بالکل بے ضرر بلکہ محافظِ صحت ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روزنامہ سن (لاہور) مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء) میں شائع شدہ نیو یارک کی تازہ تحقیقاتی رپورٹ کا ضروری حصہ نقل کر دیا جائے جو درج ذیل ہے:

"نیو یارک، ۵ اپریل - پیورٹوریکو میں قائم شدہ ایک بڑے دواساز کارخانے میں مانع حمل ادویہ تیار ہوتی ہیں۔ یہاں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کے اجسام میں نسوانی ہارمونوں کی نمایاں کثرت نمودار ہو گئی ہے۔ کیونکہ کارخانے کی فضا اور ہوا جس میں وہ سانس لیتے رہے ہیں اس میں آسٹروجن نامی کیمیاوی مواد سرایت کر چکا ہے۔ نتیجۃً کچھ مردوں کی چھاتیاں غیر فطری انداز میں بڑھ گئی ہیں اور قوت مردمی گھٹ گئی ہے۔ پانچ عورتیں جو برتھ کنٹرول کے لیے مستعمل سفوف کو ہاتھ لگاتی تھیں اور اٹھارہ میں سے دس جو محض تیار شدہ گولیوں کو مس کرتی تھیں ان کے اندام ہائے نہانی سے غیر معمولی طور پر جریان خون شروع ہو گیا۔ ایک سال تک تجرباتی معائنہ و مطالعہ کے بعد اس کے نتائج اٹلانٹا کے وفاقی مرکز میں پیش کیے گئے جو انسدادِ امراض کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر میلکم ہیرنگٹن جو اس تحقیقات کے نگران تھے، انہوں نے کہا ہے کہ ان گولیوں کی صنعت صحت کے لیے

سنگین خطرات کا باعث ہے ان سے سرطان کی پیدائش کا اگرچہ قطعی ثبوت نہیں مل سکا لیکن میں شک میں مبتلا ہوں۔
انہوں نے مزید بیان کیا کہ جس کمپنی کا اس مطالعہ و تحقیق سے تعلق ہے وہ سفوف کے گرد و غبار کے کنٹرول میں ایک مثالی معیار کی حامل تھی۔ اس کے باوجود بیماری کا وقوع یہ تقاضا کرتا ہے کہ ان کیمیکلز پر قابو پانے کے لیے کوئی نیا طریق کار وضع کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وفاقی محکمہ صحت کے ذمہ دار حضرات ایک عرصہ پہلے اس خطرے سے باخبر تھے لیکن گذشتہ مئی سے جو تحقیقات عمل میں آئی ہے اس نے دستاویزی ثبوت بہم پہنچا دیا ہے"۔

اس رپورٹ پر خود کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اسی اخبار "سن" کے اداریہ کا کچھ حصہ نقل کر دیں جو دوسرے روز ۸ اپریل کو اس رپورٹ پر بحث کرتے ہوئے چھپا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ اخبار سرکاری نقطۂ نظر اور پالیسیوں کا بالعموم حامی اور علمبردار ہے۔ اداریے کا عنوان "گولیاں اور انسان" (PILLS AN THE MAN) ہے۔ اس میں جناب مدیر فرماتے ہیں:

"فطرت انسان سے دانا تر ہے۔ فطرت سے جنگ بلاشبہ بے سود ہے۔ اس مزاحمت میں انسان خود ہی مجروح ہوتا ہے۔ انسان فطرت کو رام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار فطرت اس کی ہنسی اڑاتی ہے۔ انسان اسے قابو میں لانے کے بجائے خود اس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ فطرتی حدود کو پھاندنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس سے ڈرتے ڈرتے رہا جائے۔ انسان چاہے خارج میں، چاہے اپنے نفس میں جب فطرت کا مقابلہ کرتا ہے مار کھاتا ہے۔ امریکہ کے مرکز انسداد امراض سے جو رپورٹ حال ہی میں ملی ہے وہ یہی کچھ بتاتی ہے۔ برتھ کنٹرول کی دوائیں بنانے والے مرد اور عورتیں امراض کا شکار ہیں۔ ان کی صحت خطرات کی زد میں ہے۔ اگر کیمیاوی عناصر محض ہوا کی وساطت سے انسان کے ظاہر و باطن کو متاثر کر سکتے ہیں تو جو انسان یہ دوائیں کھاتے اور استعمال کرتے ہیں ان پر اور ان کی آئندہ فصلوں پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہوں گے؟ رپورٹ کی رو سے وہ فیکٹری جس میں دوائیں بنتی ہیں وہ بخارات و غبارات کے کنٹرول کا مثالی و معیاری بندوبست رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دواؤں کے خوردبینی ذرات بھی زہر کا اثر رکھتے ہیں۔ ان دواؤں سے کام لینے والے افراد اور ان کے بچے معلوم نہیں اپنے جسم اور خون میں کیا کچھ جذب کرتے اور آگے منتقل کرتے ہوں گے۔

> شاید یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں سے مابعد کی مردانہ نسل اپنے عادات و اطوار میں زنخہ پن کا روز افزوں مظاہرہ کر رہی ہے اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ان میں نسوانی خصائص کمتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس رپورٹ سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ ذہنی صحت ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جسے محض محکمہ صحت کے ناخداؤں کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ اُلٹا رُخ اختیار کرنے کے بجائے فطرت کی سیدھی جانب ہی رہنے کی کوشش کی جائے۔"

نت نئے اعداد و شمار کی شعبدہ بازی کے بل پہ یہ پراپیگنڈا بھی دن رات کیا جاتا ہے کہ دُنیا بالخصوص مشرقی دنیا میں خوراک کی اتنی قلت ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا نہ گیا تو انسان انسان کو کھانے لگے گا۔ لیکن اس فریب کا پردہ آئے دن چاک ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے اخبار گارڈین (مورخہ ۱۴ر جنوری ۱۹۷۶ء) میں ایک مبصر رچرڈ نارٹن ٹیلر کا مضمون چھپا ہے جس میں غذائی قحط کو محض ایک "سکینڈل" ثابت کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے دُنیا کی غذائی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۶ء تک پیداوار میں ایک سو پچپن (۱۵۵) فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ دنیا کی آبادی صرف سڑسٹھ (۶۷) فی صد بڑھی ہے۔ دنیا بھر میں قریب سوا کروڑ ٹن غذا پیدا ہوتی ہے جس کا آدھا حصّہ "ترقی یافتہ ممالک" چٹ کر جاتے ہیں حالانکہ ان کی آبادی کل دنیا کا چوتھا حصّہ ہے۔ امریکہ کے شعبۂ زراعت کی سال گذشتہ کی ایک رپورٹ کے مطابق جو ممالک غلّہ باہر سے درآمد کرتے ہیں ان کی تعداد پچاس ہے، جن میں سے چھیالیس کی زرعی پیداوار کو ملکی پالیسی کے طور پر عمداً محدود اور کم کر کے رکھا جاتا ہے۔ چین اور ہندوستان میں انسان جتنی خوراک کھاتے ہیں اتنی ہی خوراک ترقی یافتہ ممالک کے جانور کھاتے ہیں"۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی ممالک ایشیا اور افریقہ کی آبادی کم کرنے کے لیے جو دوائیں یا آلات بطور امداد بھیجنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اور جو لٹریچر روانہ کرتے ہیں کیا اس کے عوض میں وہ انسانی ہمدردی کے تحت اپنے ہاں کے کتوں، بلیوں، گھوڑوں اور بہت سے دوسرے غیر ضروری پالتو اور جنگلی جانوروں کا خاتمہ یا منصوبہ بندی کر کے اور ان کی خوراک بچا کر مشرقی ممالک کے سپرد نہیں کر سکتے؟ مگر وہ چونکہ جانتے ہیں کہ مانع حمل گولیاں کھلائے بغیر نسوانی حیا کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور مادر پدر آزاد تمدن اُن کے حسب منشا برپا نہیں ہو سکتا اس لیے وہ خوراک کی منصفانہ تقسیم سے زیادہ گولیاں اور آئی۔ یو۔ ڈی بانٹنے کی فکر میں ہیں، حالانکہ غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے عوام اِن عطیات کی وصولی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بھارت کے نئے فیملی پلیننگ کے وزیر نے کہا ہے کہ اس لفظ سے عوام اتنے متنفر ہیں کہ میں محکمے کا نام بدل کر فیملی ویلفیئر رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کسی شے کا محض نام بدل دینے سے اس کی حقیقت بھی بدل سکتی ہے؟

رُوداد ابتلا: احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۴)

اب ذرا قلعے کے جیل خانے کا حال سُنیے۔ یہ صلاح الدین ایوبی کے قلعے کا ایک حصّہ ہے۔ اِسی قلعہ میں محمد علی پاشا نے مما لیک کی گردنیں اُڑائی تھیں۔ جس حصّہ میں ہم رہ رہے تھے اُسے انگریزوں نے درست کیا تھا۔ یہ جیل خانہ تین سو سے زیادہ نظر بندوں کی گنجائش نہیں رکھتا۔ انٹیلی جنس کے ذریعہ تمام تفتیشی کارروائیوں کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہماری تفتیش بھی یہیں ہو رہی تھی۔ تنگ و تاریک اور ہوا سے محروم کوٹھڑیوں کے اندر ہم چار۔ چار، پانچ پانچ افراد رکھے گئے تھے حالانکہ ان کوٹھڑیوں میں دو سے زیادہ افراد کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ مگر یہ مشہور اصول ہے کہ "حالتِ اضطرار میں احکام تبدیل ہو جاتے ہیں"۔

ان دنوں قلعہ کے جیل خانہ میں چار سو افراد محبوس تھے۔ اور یہ اخوان کے خلاف انٹیلی جنس کی تفتیشی سرگرمیوں کے ابتدائی ایام تھے۔ ایک دوسری تفتیش جنگی جیل میں جاری تھی۔ فیوم کے جیل خانے میں بھی دو سو افراد موجود تھے۔ اور یہ فیوم کے قیدی وہی لوگ تھے جو ۱۹۵۴ء میں پیپلز کورٹ کی طرف سے صادر ہونے والی سزاؤں میں سے دس سال کی پوری مدت گذار چکے تھے اور اب دوبارہ شاملِ تفتیش کیے گئے تھے۔

قلعہ کے جیل خانے میں مَیں نے کئی دن گزارے۔ مگر اس کے باوجود وہاں کے کھانے کے بارے میں میری یادداشت بالکل معمولی ہے۔ شاید وہاں کسی انسان کو سرے سے کھانا دیا ہی نہیں جاتا تھا۔ درحقیقت ہم جس ابتلا سے وہاں دوچار تھے اُس کے سامنے بھوک کے احساس یا کھانے کی

اشتہار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شاید میں جتنی مدت قلعہ میں رہا ہوں میں نے کھانا چکھ کر نہیں دیکھا ہاں اتنا یاد ہے کہ ایک شام جب میں عذاب شدید کی بھٹی میں سُلگ رہا تھا تو ایک سپاہی نے مجھے چائے کی نصف چھوٹی پیالی پیش کی تھی۔ اور وہ چائے بھی بہت ردّی اور بدذائقہ تھی۔ یہ بھی یاد ہے کہ مسکین زکریا المشتولی جب دم توڑ رہا تھا تو میں نے اُس کے منہ میں تھوڑا سا پنیر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ پنیر مجھے کہاں سے ملا تھا۔ بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ قلعہ کے جیل خانہ میں ایک ٹھیکیدار نظر بندوں کو کھانا سپلائی کرتا ہے۔ اور یہ ٹھیکیدار ہر نظر بند سے کھانے کے عوض کچھ نہ کچھ پیسے وصول کر لیتا ہے۔ جن حالات میں ہم لوگ رہ رہے تھے کمائی کرنے والے کے لیے اُن سے بہتر اور کون سے حالات ہو سکتے ہیں۔ ٹھیکیدار جانتا تھا کہ اُس کے اِس معمولی سے فعل پر کون گرفت کر سکتا ہے۔ وہ کھانا جو سپلائی کر رہا تھا!!

جیل کی کوٹھڑیاں ایک طویل سُرنگ کے اندر تھیں جو دونوں طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ پتھر کی سیڑھیوں کے ذریعہ اُن کے اندر اُترا جا سکتا تھا۔ جب کسی شخص کو تفتیش کے لیے پکارا جاتا تو ایک عمر رسیدہ محافظ کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیتا۔ بلائے جانے والے کے لیے لازم تھا کہ وہ دوڑ کر کمرۂ تفتیش میں حاضر ہو۔ اور اگر وہ اپنے آپ پر رحم چاہتا ہے اور کچھ نہ کچھ تعذیب سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو وہ تفتیش کرنے والے کے سامنے بالکل برہنہ کھڑا ہو اور اُسے خود ہی دوڑنے کی حالت ہی میں تن کے کپڑے اُتار پھینکنے چاہییں، تاکہ کم از کم "افتتاحی ٹکٹکی" پر لٹکنے سے بچ جائے۔ زیرِ تفتیش افراد دو دو روز بالکل عُریاں کمرۂ تفتیش میں رکھے جاتے۔ اور جب وہ واپس کوٹھڑی میں آتے تو کپڑوں کی تلاش کا کوئی موقع نہ دیا جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اچانک کپڑے مل جاتے مگر اس حالت میں کہ بُری طرح خون سے آلودہ ہیں اور ان کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ اور یوں بھی ہوتا کہ کپڑے بالکل ہاتھ نہ آتے، اور وہ اُسی عُریانی کی حالت میں کوٹھڑی میں داخل ہو جاتے۔

جتنے افراد بھی قلعہ کے جیل خانہ میں موجود تھے سب گہرے اور خطرناک زخموں سے چُور تھے۔ وہاں نہ کسی ڈاکٹر کی نگرانی تھی اور نہ ابتدائی طبی امداد کا انتظام۔!! البتہ مورس نامی ایک بھاری بھرکم تن و توش کا انسان موجود تھا۔ اُسے ڈاکٹر کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ مگر اُس نے بھی مجروحین کی کبھی مرہم پٹی نہیں کی۔ بلکہ ستم یہ ہے کہ ہم نے یہ سُنا کہ بعض مجروحین کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں یہ شخص بھی شامل تھا۔

قلعہ کے ایام کی جو چیزیں مجھے یاد ہیں اُن میں سے ایک خوبرو اور ظریف نوجوان ہے۔ جس بیرک میں تفتیشی کارروائی ہو رہی تھی وہاں آکر وہ کھڑا ہو جاتا تھا اور بڑی حیا آمیز نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا۔ میں اس کی اصلیت کو نہ سمجھ سکا۔ بلکہ پہلی نظر میں میں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کوئی نظر بند ہے۔ جن لوگوں کی تفتیش ہو رہی ہوتی تھی وہ انہیں بڑی درد بھری نظروں سے دیکھتا رہتا۔ بعد میں میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی چھوٹا افسر ہے اور ابھی زیر تربیت ہے۔ زیادہ وقت نہ گزرا کہ مجھے اُس کے سپرد کر دیا گیا تاکہ مجھ پر تفتیش کا طریقہ سیکھنے کی مشق کرے۔

ایک چھوٹی سی میز پر مجھ سے متعلق کاغذات (جو میری رہائش گاہ سے اُٹھا لیے گئے تھے) پڑے تھے۔ ان میں کچھ ذاتی خطوط تھے جن کا مضمون اور بھیجنے والے کا نام اب مجھے یاد نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ اور عیسائیت کے موضوع پر میرے چند مقالات اور نوٹس تھے۔ ایک ۱۹۶۵ء کی چھوٹی سی ڈائری تھی۔ وہ خوبرو اور ظریف نوجوان یہ کاغذات اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ اور پھر میرے قریب آکر مجھ سے پوچھنے لگا: کیا تمہارے گھر میں فون ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں۔ یہ جواب سنتے ہی اس خوبرو اور ظریف نوجوان نے ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ قریب تھا کہ اس سے میری آنکھ پھوٹ جاتی۔ کچھ اور میرے نزدیک ہوا، اور شرربار آواز کے ساتھ وہ مجھے کہنے لگا: "اے کتے کے بچے! کیا جھوٹے بیانات سے تفتیش کا آغاز ہوگا" میرا دماغ جواب دے گیا۔ میرے گھر میں فون کہاں ہے۔ میں نے اُسے حیرت اور افسوس کے جذبات میں ڈوب کر کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے گھر میں فون نہیں ہے۔ پھر کیا تھا۔ اُس خوبرو اور ظریف نوجوان کی طرف سے مجھ پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ وہی نوجوان تھا جو چند لمحات پہلے ہم نکبت زدہ انسانوں کی طرف رحم طلب اور درد آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اُسے بار بار یقین دلاتا رہا کہ میرے گھر پر فون نہیں ہے۔ اور اگر وہ میرے جواب میں شک کر رہا ہے تو جیل خانے کے فون کے ذریعے ٹیلیفون کے محکمہ سے دریافت کر لے۔ اور اگر میرے گھر پر فون ہے تو مجھے اس کا انکار کرنے سے کیا دلچسپی ہے جبکہ ٹیلیفون کا لگانا ابھی تک حکومت کی طرف سے ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ مگر میری یہ سب گذارشات بے اثر رہیں۔ یہ افسر بڑا کم فہم نکلا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ میری جان لے لے گا۔ آخر کار میں نے اس بحث و مباحثہ کا جب کوئی حاصل نہ دیکھا تو میں نے تسلیم کر لیا کہ میرے گھر پر فون ہے۔ اس کے بعد فوراً اُس خوبرو

اور ظریف نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی - کامیاب تفتیش کی مسکراہٹ ! - میں نے خیال کیا کہ یہ بحرانی مرحلہ بعافیت رفت گذشت ہوگیا - مگر اچانک اس نے ٹیلیفون کا نمبر پوچھ لیا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا - میں اُسے کوئی بھی نمبر بتانے کے لیے تیار ہوا تھا کہ میں نے دیکھ لیا کہ میز پہ رکھی ہوئی میری چھوٹی سی ڈائری کو پڑھ رہا ہے - میں رُک گیا - مجھے یاد آیا کہ آغاز سال میں جب میں نے یہ ڈائری خریدی تھی تو میں نے اس کے پہلے صفحہ پر لکھے ہوئے تمام خانے پُر کر دیے تھے - نام، پتہ، ٹیلیفون کا نمبر - یہ میرے ایک دوست کا ٹیلیفون نمبر تھا - اور اسی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اس کا ٹیلیفون نمبر اپنی ڈائری میں درج کر لوں - میں نے اس افسر کے سامنے وہ نمبر فوراً دہرا دیا - آہ ! اُس خوبرو اور ظریف نوجوان اور اُس کے معاونین کی طرف سے زدوکوب کی بارش شروع کی - میرے سر پر گالیوں اور لعنتوں کی بوچھاڑ یوں ہو رہی تھی جیسے دہکتے ہوئے کوئلے مجھ پر پھینکے جا رہے ہوں - یہ خوبرو اور ظریف نوجوان افسر زیر لب بڑبڑاتے ہوئے مجھے کہنے لگا: کتّے کے بچے، انکار کا کیا حاصل - ہم تمہاری ایک ایک بات جانتے ہیں -

ایک اور فوجی افسر عبدالمنعم الصبری نے مجھے اس خوبرو اور ظریف نوجوان سے آکر چھڑایا - مگر یہ خوبرو اور ظریف نوجوان مجھے اُس روز اس قدر مار چکا تھا کہ موت نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال لی تھیں - یہ نوجوان یہ فرض کر بیٹھا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم کی قیادت کر رہے ہیں - اس مفروضہ کی وجہ سے اب یہ ناگزیر سمجھا جا رہا تھا کہ میں تنظیم کی قیادت کے بارے میں مفصل بیانات پیش کروں - گو یہ بات بالکل محال اور غلط تھی - مگر میں نے انکار کا بھی کوئی حاصل نہ دیکھا - عقلمند انسان کے لیے وہاں یہی مناسب بلکہ لازم تھا کہ وہ سوال سنتے ہی جواب دینے لگے - کوئی سا جواب - تردد اور تامّل ہرگز نہ کرے - فرفر بولتا چلا جائے - جن باتوں کا اُس نے ارتکاب نہیں کیا ہے انہیں بلا جھجک تسلیم کرتا جائے - اُسے وسیع الخیال ہونا چاہیے - جو کہانی گھڑے اُس کا تانا بانا اور گرہیں اچھی ہونی چاہییں - تفتیش کنندہ افسر کو اُس کی کہانی میں سے دروغ و دجل کی بُو تک نہیں آنی چاہیے - یہ سب کچھ اُسے کرنا ہوگا ورنہ اُس کے لیے عذاب مہین ہے -

عبدالمنعم الصبری مجھے جیل کے صحن میں لے گیا اور ہم ایک کونے میں جا بیٹھے - وہ میرے ساتھ

دوستی اور ہمدردی کا اظہار کرنے لگا۔ اس سے میرے دل میں کچھ اطمینان و سکون کی لہر اٹھی۔ اُس نے بڑی سادگی کے ساتھ مجھ سے کوئی بیس مرتبہ پوچھا کہ اخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم اور اُن کی پانچ رُکنی رہنما کمیٹی کے بارے میں کیا کچھ تفصیلات ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گفتگو نے خوش کن انداز اختیار کر لیا ہے، اور میں جو کچھ کہوں گا یہ شخص اُسے درست مان لے گا۔ چنانچہ خود میں نے بھی بڑے سادہ انداز میں اُسے جواب دیا، پانچ رُکنی کمیٹی کے بارے میں مجھے قطعاً کوئی علم نہیں ہے۔ اور میرے خیال میں اس نام اور وصف کی کوئی کمیٹی سرے سے ہے ہی نہیں۔

تمہارا یہ خیال کس بنا پر ہے؟

یہ میرا تاثر ہے۔ میری معلومات بھی یہی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اخوان اور ان کی خفیہ تنظیم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے؟

ہرگز نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ شرافت اور خوش ذوقی کا اسلوب بے فائدہ رہے گا۔

یہ کہتے ہی وہ شخص جو بظاہر دھیما اور نرم گو انسان تھا یک بیک خونخوار درندہ بن گیا۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری۔ جسے سنتے ہی ہر طرف سے جلاد جمع ہو گئے۔ انہوں نے میرے کپڑے اُتار دیے جن کے پہننے کی اس افسر نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ اور اب مجھے گھونسوں، مکّوں، ٹھوکروں اور گالیوں کے جلو میں تعذیب خانے میں لے چلے۔ اے میرے خدا، اب تو ہی وارث ہے۔

تعذیب خانے کے کیلنڈر میں رات اور دن کی کوئی تفریق نہ تھی۔ تعذیب مسلسل جاری رہتی بے انتہا اور نہ انتہا کی کوئی اُمید۔ ہمیں کچھ ہوش نہ رہتا کہ ہم کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ کبھی ہم اپنے آپ کو تعذیب خانے میں پاتے، کبھی کوٹھڑیوں کے اندر، کبھی بیت الخلاء کے اندر۔ بے حس اور فاترالعقل۔ ابتلا و تشدد کے بادل اُمڈ اُمڈ کر آتے۔ ان کی شدت سے ہم نیم جان ہو جاتے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ شریف شہریوں کو گوشے گوشے سے پکڑ پکڑ کر لایا جا رہا ہے۔ کسی گناہ اور کسی جرم کا اُن سے صدور نہیں ہوا۔ سنگدل افسر انہیں درندوں کی طرح چیر پھاڑ رہے ہیں۔ اُن سے ایسا راز دریافت کیا جا رہا ہے جسے وہ نہیں جانتے۔ ہر شخص عذاب کی بھٹی میں جلایا جا رہا ہے۔

قلعہ جیل کا خونیں ڈرامہ ایک روز ختم ہو گیا۔ تین سے زیادہ انسانی جانیں اس ڈرامے کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ چار سو کے قریب افراد گھرے اور خطرناک زخموں سے دوچار ہوئے۔ چار چار کی ٹولیوں میں ہمیں کوٹھڑیوں سے نکالا گیا۔ جیل خانے کے صحن میں ہم جمع ہو گئے اور یہ پورا صحن بھر گیا۔ لاٹھیاں، کوڑے اور آلاتِ تعذیب غائب ہو گئے۔ حتیٰ کہ تعذیب کی مہمات سرانجام دینے والوں کے چہرے بھی ہمیں دکھائی نہ دیے۔ حاضرین میں سے کوئی شخص اس نئی کارروائی کا راز نہ سمجھ رہا تھا۔

اُسی کھڑکی سے جس میں سے ہم دُنیا کو الوداع کہہ کر قلعہ کے جیل خانے میں داخل ہوئے تھے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی اندر آیا۔ لاغر اور نحیف جسم، چہرے کے خدوخال باریک اور غیر نمایاں۔ منہ میں سگرٹ لیے ہوئے جسے ہونٹوں میں لینے کے بجائے ہونٹوں میں تھامے ہوئے تھا۔ اُس کی مصاحبت میں تیس سال کا ایک نوجوان تھا۔ گندمی رنگ اور موٹے موٹے نقوش۔ یہ نوجوان بولا کہ جناب ڈاکٹر صاحب آپ لوگوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگ خوف زدہ نہ ہوں، اب تعذیب کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ جس جس شخص کو شدید زخم آچکے ہیں وہ اپنا ہاتھ اُٹھائے۔ اُس کے اعلان پر اکثر لوگوں نے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُن کو جو زخم پہنچ چکے تھے وہ شدید سے بھی بڑھ کر تھے۔

ڈاکٹر قطاروں کے اندر سے گزرتا گیا۔ زخمیوں کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر رنج و ملال اور دردمندی کے اثرات طاری ہو رہے تھے۔ جب کوئی گہرا زخم دیکھتا تو برملا جلادوں پر لعنت بھیجتا۔ اور اپنے ساتھی نوجوان کو حکم دیتا کہ زخمی شخص کا نام فہرست میں لکھ لیا جائے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر تمام نظربندوں کے حوصلے بیدار ہو گئے، اور وہ سب حکومت کو گالی دینے لگے اور ظلم اور ظالموں پر لعنت بھیجنے لگے۔ ڈاکٹر بھی سر ہلا ہلا کر ان کے جذبات کی تائید کرتا، اور انہیں دلاسا دیتا۔ یوں وہ ایک ایک زخمی کے پاس سے گزرا۔

یہ ڈاکٹر بریگیڈیر احمد رُشدی تھا۔ ابوزعبل کے تعذیب خانے کا کمانڈر۔ یہ راز چند گھنٹوں کے اندر ہی ہم پر منکشف ہو گیا۔ ہم ابوزعبل پہنچے ہی تھے کہ اس نے جس جس شخص کا نام فہرست میں درج کیا تھا اُسے خوب مارا۔ قلعہ میں جب لوگ معائنہ کروا رہے تھے اُس وقت ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میں نے اپنے زخم دکھانے سے گریز کیا تھا۔ مگر اِس کے باوجود کہ میرا نام فہرست میں درج نہیں تھا میں بھی اس ظالمانہ مار سے نہ بچ سکا۔

ہم ملٹری پولیس کی بند گاڑیوں میں سوار ہو کر ابوزعبل کی طرف چل دیے۔ ان گاڑیوں کے عقبی دروازے میں عسکری پولیس کے سپاہی سرکاری لباس میں بیٹھے تھے۔ سڑکوں پر ان گاڑیوں کو گزرتے ہوئے دیکھ کر عام لوگ یہی خیال کرتے ہوں گے کہ یہ گاڑیاں فوجی جوانوں کو لیے جا رہی ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ مظلوم نظربندوں کا قافلہ تھا۔ حالیہ تجربات سے پہلے میں بھی اس طرح کی بکثرت فوجی گاڑیاں اِدھر اُدھر گزرتی دیکھتا تھا۔ مگر اب مجھے پتہ چلا کہ وہ گاڑیاں دراصل ہمارے ایسے بھائیوں کو اُٹھائے لیے جا رہی ہوتی تھیں جو راہِ حق میں ہمارے پیشرو بنے۔ ہم اپنی گاڑی میں تیس افراد تھے۔ ہمارے ساتھ بدر الفضیبی بھی تھے۔ انہیں چونکہ بہت ہی خطرناک زخم لگ چکے تھے اس لیے ہم نے اُنہیں ایک کمبل میں ہاتھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ (ابوزعبل پہنچنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی بیچارے نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی)۔

راستے میں مَیں گاڑی میں سے باہر جھانک کر باشندگانِ مصر کو دیکھتا۔ وہ اُسی طرح چل پھر رہے تھے جیسے پہلے چلتے پھرتے تھے۔ زندگی کی رفتار میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ کسی کو کوئی غرض نہ تھی کہ کیا کچھ گزر رہی ہے۔ المقشرہ (ممالیک کے عہد میں تعذیب خانے کو المقشرہ کہا جاتا تھا) میں کیا کھیل کھیلا گیا، اس کے بارے میں غالباً عام لوگ کچھ جانتے بھی نہ تھے۔ سڑکوں پر موٹریں فراٹے بھرتی جا رہی تھیں۔ راہ گزر باہمی میں مشغول تھے۔ بس سٹاپ پر لڑکے لڑکیوں سے آنکھ مچولی کر رہے تھے۔ سیلابِ زندگی حسبِ معمول رواں دواں تھا۔

مجھے یاد ہے کہ گاڑی میں جتنے میرے ہمسفر تھے، اُن کے چہرے تبسم ریز تھے۔ اور اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ عذابِ الیم کے چنگل سے نجات پانے کی وجہ سے ان کے دل غیر معمولی مسرت میں ڈوب رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک نوجوان ایسا تھا جو نفسیاتی طور پر بہت رقیق القلب اور بے حوصلہ تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا اُسے بھی تسلیم کرتا رہا اور جو نہ کیا اُسے بھی تسلیم کرتا رہا۔ اس جلد بازی میں ہم اسے کچھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے اور سمجھاتے کہ ذرا صبر اور حوصلہ سے کام لو۔ مگر وہ کسی کی نہ سُنتا۔ اس نوجوان کا خیال تھا کہ اب مرحلہ تفتیش ختم ہو گیا ہے اور سب لوگوں کو ان کے "جرائم" کے مطابق مختلف سزائیں مل چکی ہیں، سزاؤں کے احکام صادر ہو چکے ہیں اور ابوزعبل ہماری منتقلی سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ ہے۔ جب ہم ابوزعبل پہنچیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ کس کو کتنی سزا ملی۔ اس نوجوان کو میں بہت سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ سزا

کے احکام صادر کرنے کے لیے عدالتی کارروائی اور قانونی تدابیر ناگزیر ہوتی ہیں۔ لیکن اُس نے کہا: "اے دوست، مصر میں ان باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتا"۔ پھر وہ انتہائی استہزا کے ساتھ زیر لب کہنے لگا: "قانون؟ عدالت؟ ضابطے کی کارروائی؟ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ بھول گئے کہ آپ مصر میں رہتے ہیں ـــــ مصر ـــــ عجائبات"؟ بے شک اُس کی دلیل میری دلیل کی نسبت زیادہ قرینِ صواب تھی۔ وہ دوبارہ جذبات میں آیا اور کہنے لگا کہ لیمان طرہ (ابوزعبل کی جیل) پہنچ کر ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم حکومت کے حامی بن جائیں۔ اُسی وقت حکمران ہمیں رہا کر دیں گے، خواہ ہم نے اُن کے ساتھ کیسے بڑے بڑے "جرائم" کا ارتکاب ہی کیا ہو۔"

یہ تمام معاملہ بڑا اندوہناک اور جگر پاش تھا۔ الم و حزن کے سایے ہی ہمارے منڈلا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ کس لیے یہ انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے؟ اس کی کیا بنیاد ہے؟ کس کی خاطر کیا جا رہا ہے؟ اس طرح کے متعدد سوالات میرے ذہن میں پہلے گردش کرتے، پھر ان کی ایک زوردار گھنگھناہٹ کانوں کو سنائی دیتی اور پھر وہ اُن زخموں پر مزید نمک پاشی کرتے جن کے عذاب میں مَیں مبتلا تھا۔

ہفتے کا دن تھا۔ عصر کے وقت ہم ابوزعبل کی جیل میں پہنچے۔ تعذیب کا دَور ختم ہو جانے پر ہم بڑے خوش و خرم تھے۔ اس وقت تک یہی گمان تھا۔ کیونکہ انٹیلی جنس والوں نے بھی خوب اندازہ کر لیا تھا کہ تعذیب کے ہتھکنڈے کارگر ثابت نہیں ہوئے۔ اب ہم ابوزعبل میں کچھ مدت گزاریں گے یہاں تک کہ زخم مندمل ہو جائیں۔ اس کے بعد ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی راہ لے گا ـــــ اس طرح کی قیاس آرائیوں کے پھیلنے کی وجہ سے ہمارے اندر تازگی اور مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ یہاں تک کہ جب گاڑیوں سے اُتار کر ہمیں ابوزعبل کے افسروں کے حوالے کیا جا رہا تھا تو ہم قہقہے مار رہے تھے۔

جیل کا ایک افسر جب نظر بندوں کو وصول کر رہا تھا تو ایک ایک کر کے انہیں باقاعدہ گنتا تھا۔ اس پر ہمارے لانے والے نگران عسکری نے کہا: "مسٹر اسماعیل طرکی کوئی بات نہیں انہیں وصول کر لے۔ گنتی میں کوئی کمی رہ گئی تو میں اُسے پورا کر دوں گا"۔ یہ سن کر مسٹر اسماعیل نے تعداد گھٹ جانے کا خیال کیے بغیر نظر بند وصول کر لیے ـــــ یہ چھوٹا سا جملہ ہمیشہ میرے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں یہ شخص کیونکر گھٹ جانے والے آدمیوں کی کمی پوری کرتا ہوگا۔ کہاں سے انہیں لاتا ہوگا۔ بیشک وہ جہاں سے بھی چاہے آدمی لا کر کمی پوری کر سکتا ہے۔ درحقیقت کسی شخص کو یہ

ہوش نہ تھا کہ دوسرے پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ برحق پابند سلاسل ہے یا ناحق۔

میں عرض کر آیا ہوں کہ ہم بدر القصیبی کو بازوؤں پر اٹھا کر لائے تھے۔ اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ جیل کے دروازے کے پاس ہمیں میجر فوزی نظر آیا۔ جو بعد میں کچھ مدت کے لیے جیل کا کمانڈر بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بدر القصیبی کو دیکھ کر میجر فوزی بڑا دلگیر ہوا۔ بیچارے بدر القصیبی کو قلعہ والوں نے مار مار کر گندھے ہوئے آٹے کی مانند کر دیا تھا۔ میجر فوزی نے ہمیں کہا کہ اسے فوراً ایک کوٹھڑی میں لٹا دو۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بدر کو نہیں دیکھا۔ بدر تاریخ کے اسٹیج سے ہٹ گیا۔ یا تاریخ کا ایک اہم جزو بن گیا۔۔۔۔۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ بدر کی قبر کہاں ہے!

ابوزعبل کی جیل تین منزلہ عمارت میں ہے۔ ہر منزل میں بارہ حجرے ہیں۔ ہر حجرے کو "بیرک" کا نام دیا جاتا ہے۔ عمارت کا صدر دروازہ لوہے کی سلاخوں سے بنا ہوا ہے۔ چار دیواری پر بھی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ یوں اس کا صحن مضبوط و مستحکم قفس کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمارت تو ابوزعبل کے علاقے میں پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ نئی عمارت سابقہ عمارت کے کھنڈروں پر بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت سے دو سو میٹر کے فاصلے پر ریڈیو اسٹیشن ہے جب ۱۹۵۶ء کی جنگ میں ریڈیو اسٹیشن پر گولہ باری ہوئی تو اس عمارت کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ اس کی ابھی ابھی تجدید و ترمیم کی گئی ہے۔ ٹھیکیدار کی طرف سے محکمۂ جیل خانہ جات کو یہ عمارت ابھی چند روز بعد سپرد کی جانے والی تھی۔ مگر جیسا کہ ہم نے سنا انٹیلی جنس کے محکمہ نے ٹھیکیدار سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے جلد از جلد مکمل کر دے۔ طے تو یہ تھا کہ یہ عمارت کمیونسٹوں کا استقبال کرنے والی ہے۔ مگر مشیت الٰہی کا فیصلہ کچھ اور نکلا۔

جیل خانے میں ہم غروب شمس سے پہلے پہلے داخل ہو گئے۔ اندر مزدور ابھی جلدی جلدی کام مکمل کر رہے تھے۔ جیل میں داخل ہوتے وقت ہمیں عذاب کے فرشتوں میں سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ بلکہ جو لوگ ہمیں ملے وہ وسیع الظرف، نرم خو اور رقیق القلب نظر آئے۔ انہوں نے بڑی لطافت اور نرمی سے ہمارے ساتھ معاملہ کیا۔ ہم میں سے ہر شخص نے تین تین کمبل وصول کر لیے۔ بالکل نئے کمبل جو ابھی استعمال میں نہ آئے تھے۔ ایک کٹورا، ایک چمچہ اور ایک چمکدار المونیم کی پلیٹ۔

فضا بڑی خوشگوار اور حوصلہ افزا تھی۔ خوش بختی اور نیک فرجامی کے احساسات ابھار رہی تھی۔ ہم میں سے

ہر شخص اپنے دل کو بہلا رہا تھا کہ وہ اس صاف ستھری اور بالکل نئی عمارت میں بڑے آرام کے ساتھ خوشگوار اور شریفانہ زندگی گزارے گا۔

ایک بیرک میں زیادہ سے زیادہ تیس آدمیوں کی گنجائش تھی۔ بعد میں اُس میں ایک سو تیس افراد ٹھونسے گئے۔ مجھے بیرک نمبر ۱ میں کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ رکھا گیا۔ میں بڑا خوش تھا کہ میرے تمام دوست اسی بیرک میں رکھے گئے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی اقامت گاہ سنبھال لی۔ اور ہم بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ لیٹ گئے۔ کھانا آیا۔ یعنی لوہے کے غلیظ برتنوں میں دال بھری ہوئی تھی۔ جسے سلاد کے ساتھ پکایا گیا تھا۔ اور دال میں بے شمار کنکریاں ملی ہوئی تھیں۔ الغرض دال بہت ہی ردی تھی، اور برتن بھی بہت گندے تھے، اور اس پر مستزاد سلاد اور کنکریوں کی بڑی مقدار اس میں شامل تھی۔ مگر بایں ہمہ ہم نے اُسے بڑے اشتہا کے ساتھ کھایا۔ ہم میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے قلعہ کے جیل خانے میں قطعاً کوئی چیز نہ کھائی تھی۔

ہمیں انتہائی گھٹیا صابون بھی دیا گیا۔ یہ صابون جیل کے قیدیوں کی پروڈکشن تھی۔ کئی روز سے ہم نے صابون کی شکل نہ دیکھی تھی، صابون لیتے ہی ہم غسل خانوں کی طرف بھاگے تاکہ اپنے بچے کھچے کپڑوں کو دھو ڈالیں جو طرح طرح کی اشیا سے آلودہ ہو چکے تھے اور ان میں سب سے نمایاں وہ خون تھا جو قلعہ کی جیل میں کپڑوں سمیت بہایا گیا۔ غسل خانے میں دو پیشاب اور پاخانے کے پائیدان تھے۔ اور ایک حوض تھا جس میں تین ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں اور بیک وقت تین اشخاص پانی لے سکتے تھے۔ دونوں پائیدانوں پر دو شاور بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور ہم میں سے ہر ایک ٹھنڈے پانی کے ساتھ لطف لے کر نہایا اور اُس نے جسم پر گردِ سفر اور گردشِ ایام کے جو اثرات چپکے ہوئے تھے اُتار دیے۔

کچھ ایسے بھی درماندہ انسان تھے جو زخموں کی کثرت اور شدت کی وجہ سے نہ کپڑے دھو سکے اور نہ نہا سکے۔ مگر وہ لوگ اپنی غلاظت و آلودگی کے باوجود خوش و خرم تھے۔ اس لیے کہ وہ اب قلعہ کی خوفناک اور زہرہ گداز دنیا سے دُور ہو چکے تھے۔ بیرک کے جس حصے میں ہم سوتے تھے اُس کا دروازہ سلاخوں والا تھا (ان سلاخوں کے اندر سے صرف کھانا داخل کیا جا سکتا تھا) میں نے پورے حصے پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے اکثر مکین سن رسیدہ بوڑھے ہیں۔ نوجوان صرف چند ایک ہی ہیں جو یحییٰ حسین کے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک خود میں ہوں۔

یہ دلچسپ پہلو سامنے آیا کہ اس بیرک کے جملہ باسی مصر کی تقریباً تمام موجودہ اسلامی تنظیموں کے وابستگان (باقی بر صفحہ ۴۸)

مطبوعات

روس میں مسلمان قومیں | تالیف: جناب آباد شاہ پوری صاحب

شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

صفحات: ۴۶۳

قیمت: ۱۹/۵۰ روپے

زیر تبصرہ کتاب کے مصنّف علمی دُنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے اس میں فکری گہرائی اور مطالعہ کی وسعت دونوں خوبیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب فاضل مصنّف کی برسوں کی علمی کاوش کا ثمرہ ہے۔ اس میں آباد شاہ پوری صاحب نے ناقابل تردید شواہد کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ سُرخ سامراج نے روس کے زیر تسلط مسلمان ریاستوں کو کس بے دردی کے ساتھ تاخت و تاراج کیا ہے اور وہاں اسلام اور اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کس قسم کے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دینی اعتبار سے وہ مردم خیز خطّے جن میں کبھی امام بخاریؒ اور ان جیسے دوسرے بزرگ پیدا ہوئے وہاں اب کوئی اوسط درجے کا عالم بھی پیدا نہیں ہوتا؛ اس افسوسناک انحطاط کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ اشتراکیت کے پرستاروں نے ناقابل بیان تشدّد سے کام لے کر مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کو دینِ حق سے بیگانہ بنا دیا ہے۔

یہ کتاب بڑی معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔ اور ہم تمام نوجوانوں سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) فقر بالعموم تہذیب و تمدّن کے کھنڈرات اور روحانی اقدار کے ملبہ پر ہی اُٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص فاشزم کا علمبردار بن کر اُٹھتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس قوم کی تہذیبی اور روحانی اقدار کو تباہ کرتا ہے تاکہ اُس کے افراد کا نقطۂ نگاہ صرف جیب اور پیٹ کی ضروریات تک محدود ہو کر رہ جائے اور ان میں جنسی لذات سے بلند ہو کر کسی اعلیٰ نصب العین کے متعلق سوچنے کی خواہش، ہمت اور صلاحیت باقی نہ رہے۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

میں سے ہیں رمثلاً، جمعیت الصراط المستقیم، مردے دفن کرنے کی رفاہی انجمن، جمعیت شرعیہ، تبلیغی اسلامی جمعیت، اور بھی بہت سی جماعتیں۔ کچھ افراد حزب التحریر الاسلامی کے بھی تھے۔ اخوان المسلمون کے افراد ان سب سے زیادہ۔ درحقیقت یہ قضیہ ہی اخوان سے منسوب تھا۔ کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کا رشتہ کسی مذہبی یا غیر مذہبی تنظیم یا ادارے سے نہیں تھا۔ لیکن اُن کی رشتہ داری ایسے لوگوں سے تھی جو کسی نہ کسی جماعت سے وابستہ تھے۔ اسی لیے وہ بھی دھر لیے گئے۔ مزید برآں ایسے لوگوں کی بھی ایک تعداد یہاں محبوس تھی جو نہ خود کسی چیز سے وابستگی رکھتے تھے اور نہ وابستگانِ دین و سیاست سے ان کو کوئی غرض تھی۔ ایسے افراد کے وجود پر ہم بارہا انگشتِ حیرت منہ میں لیتے رہے —— مگر یہ حیرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔

پہلی رات ہم نے تعارف، تبادلۂ خیال اور تبادلۂ لطائف میں گزاری۔ اور قلعہ میں جو . . . لوٹے اُن کا تذکرہ چھیڑا گیا —— میں تو یہ گمان کرتا تھا کہ ہم قلعہ کے رنج و محن کی یادوں میں گھرے رہیں گے۔ اس لیے کہ ان رنج و محن کا محض خیال ہی ہماری عقل و فکر کو ماؤف کر دیتا تھا۔ ہمارے جسم اور چیتھڑوں پر اُن کے نشانات چمک رہے تھے۔ یہ رستے ہوئے زخم، یہ خون کے لالہ گوں دھبے اور یہ لاجوردی لکیریں کس شدت کے ساتھ قلعہ کی یادوں کو تازہ رکھے ہوئے تھیں۔ الغرض قلعہ میں ہم نے جو چند روز گزارے ذہن بلبلا بلبلا کر کہہ رہا ہے کہ وہ چند دن نہیں تھے صد سالہ دَورِ چرخ تھا۔ مگر اس سب کے باوجود ہم خوش گفتاری اور لطیفہ بازی پر آ گئے۔ یہ عمارت جس میں ہم آج آ ترے گئے ہیں بالکل نئی ہے اور بڑی نفیس و پُر رونق۔

(باقی)

الجہاد فی الاسلام

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اوّلین تصنیف

— جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی

— جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔

— جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔

— اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانون صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔

— دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات

اور

بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ

— اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔

— جہاد کے مخالفین و معترضین کا مسکت جواب

درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

چھ سو صفحات — — قیمت ۲۳/۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ۔ لاہور